www.urducouncil.nic.in

اگست 2023، قیمت :- ₹10

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

جھنڈا اونچا رہے ہمارا

بچوں کے قلمکاروں کے لیے سوالنامہ

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' میں بچوں کے قلمکاروں سے انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے تاکہ بچوں کو قلمکاروں اور کتابوں کے بارے میں معلومات کے ساتھ ساتھ اپنا مستقبل اور کریئر بہتر بنانے کے لیے نئی روشنی اور نئی راہ بھی مل سکے۔
یہ ادارے کی طرف سے تیار کردہ سوالات ہیں، ان کے جوابات ادب اطفال سے جڑا ہوا کوئی بھی قلمکار دے سکتا ہے۔

1. بچپن کی کون سی باتیں/شوخیاں/شرارتیں اب بھی آپ کو بہت یاد آتی ہیں؟
2. بچپن میں آپ کے پسندیدہ مصنفین کون تھے اور اب کون ہیں؟
3. بچپن میں کس کتاب نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟
4. بچپن میں بچوں کے کون سے رسائل آپ پڑھتے تھے؟
5. بچوں کے ذہنی اور فکری ارتقا کے لیے کون سی کتابیں زیادہ مفید ہیں؟
6. زبان و بیان کو بہتر بنانے کے لیے کن مصنفین کی کتابیں بچوں کے لیے رہنما ثابت ہو سکتی ہیں؟
7. مستقبل اور اپنے کریئر کو سنوارنے کے لیے بچوں کو کن موضوعات اور کتابوں کا مطالعہ کرنا فائدہ مند ثابت ہوگا؟

---

8. اپنے سوانحی اور تعلیمی کوائف کے بارے میں کچھ بتائیں؟
9. آپ کو بچوں کے لیے لکھنے کا خیال کب اور کیسے آیا؟
10. آپ کی پہلی تخلیق، کب اور کس رسالے میں شائع ہوئی؟
11. آپ کے مرکزی موضوعات کیا ہیں؟
12. کتاب لکھنے سے پہلے آپ بچوں کی نفسیات اور ذہنی مطالبات پر ریسرچ کرتے ہیں یا نہیں؟
13. بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آپ کو کس طرح کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟
14. ادیب اطفال کی حیثیت سے ادبی اور علمی حلقے میں آپ کی قدر ہوتی ہے یا نہیں؟
15. کیا آپ اب بھی بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں پڑھتے ہیں؟
16. انگریزی اور دیگر زبانوں میں شائع ہونے والے کون سے رسالے بچوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں؟
17. کیا اردو میں بچوں کے لیے انگریزی، تیلگو اور دیگر زبانوں جیسا شائع ہونے والا کوئی مکمل رسالہ موجود ہے؟
18. بچوں کے ادب پر جو رسائل شائع ہو رہے ہیں، ان کے مواد اور زبان و بیان سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟
19. معاصر ادب اطفال سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟
20. بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آج کے دور میں کن موضوعات پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے؟
21. بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کچھ مفید تجاویز اور مشورے!
22. ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' میں آپ کس نوع کی تبدیلی چاہتے ہیں؟
23. بچوں کے لیے آپ کا کوئی پیغام!

* جوابات کے ساتھ پاسپورٹ سائز تصویر اپنی کتابوں کا عکس ضرور ارسال کریں۔

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ
اداریہ	مدیر	04
ڈاک خانہ	قارئین	05
	جشن آزادی	
جھنڈا اونچا رہے ہمارا	شفیع الدین نیر	07
ترنگا	نصرت شمسی	08
آزادی کا دن آیا	تبسم سحر	11
آزادی	ظہیر رانی بنوری	12
خوں بہا کر وطن یہ ملا ہے	محمد وکیل	13
پندرہ اگست	مدثر عمر کیفی	13
یہ ہے اپنا ہندوستان	عذرا خاتون	14
پندرہ اگست	سید عشقان رہبر	15
ہمارا قومی پرچم	سید واجد علی شاہ جیلانی	16
	انٹرویو	
کامکس بچوں کی دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں	عاکف سنبھلی	18
	ڈراما	
پاپا کیا سوچیں گے	عظیم اقبال	23
	نظمیں	
ساحل اور سمندر سے باتیں	عبدالودود انصاری	26
طوطے کی بات	مختار ٹونکی	27
تمھیں بدھائی	ضیاء الرحمٰن جعفری	28
پانی سے زندگی ہے	پرویز مانوس	29
اب تھم بھی جا	الماس محمود	30
ابو ہمارے	مصباح الدین طارق	30
بلبل	فردوس بانو	31
	کہانیاں	
احساس	اسد رضا	32
برسات کی ایک رات	شہاب افسر خان	34
انمول تحفہ	افتخار انیس حمیدی	37
مون چاند	توصیف بریلوی	40
لومڑی کا ننھا بچہ	حمیرا عالیہ	42
	سیاحت	
جس نے گلابی شہر نہیں دیکھا...	زینت اختر	45
	باردگر	
نیکی کا صلہ	رضی اللہ دہلوی	48
	بچوں کا کتب خانہ	
اچھے چاچا اور دیگر ڈرامے: ظہیر انور	حقانی القاسمی	50
	صحت	
لیچی: پیاس کو کم کرنے والا پھل	محمد خلیل	53
	زبان شناسی	
ساز و سامان تحریر	نعیمہ جعفری پاشا	55
	کہکشاں	
چمن چمن کے پھول		59
	ننھے فنکار	
پینٹنگ		60

بچوں کی دنیا

جلد: 11 شمارہ: 08 اگست 2023

مدیر: پروفیسر شیخ عقیل احمد

نائب مدیر: عبدالباری

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000
شعبہ ادارت: 49539009-11
ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in
ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10 روپے، سالانہ/100 روپے

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت
ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم
نئی دہلی- 110066
فون:26109746

ای میل: sales@ncpul.in

علاقائی مرکز: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد- 500002
فون: 040-24415194

پیارے بچو! پندرہ اگست کا دن ہمارے اور ہمارے ملک کے لیے بہت خاص ہے، پورے ملک میں خوشی و شادمانی کا ماحول ہوتا ہے، ہر کوئی اس دن کی تیاری جوش و خروش سے کرتا ہے۔ اس دن کو لوگ قومی تہوار کے طور پر مناتے ہیں۔ 15 اگست کے دن ملک میں تعطیل رہتی ہے، قومی اور ریاستی سطح پر مختلف طرح کے ثقافتی پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں، وزیر اعظم لال قلعہ پر پرچم کشائی کرتے ہیں، اس تقریب کو دیکھنے کے لیے بہت سے لوگ لال قلعہ کے ارد گرد جمع ہوتے ہیں اور یوم آزادی حب الوطنی کے پورے جوش اور جذبے کے ساتھ مناتے ہیں۔

15 اگست 1947 کو ہمارا ملک انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوا، اس ملک کو آزاد کرانے کے لیے ہزاروں لوگوں نے قربانیاں دیں، ملک کی سربلندی اور آزادی کے لیے اپنی جان کے نذرانے پیش کیے، آج ہم آزاد ملک میں سانس لے رہے ہیں، ہم اپنے حساب سے روزمرہ کی زندگی بسر کر رہے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ ہم آج کے دن مجاہدین آزادی کی قربانیوں کو یاد کریں کہ انھوں نے کس طرح آزادی کی خاطر ہر قسم کی پریشانی کو برداشت کیا، انگریزوں کے ظلم و ستم کا مردانہ وار مقابلہ کیا، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، اس کے باوجود ان کے جوش و جذبے میں ذرہ برابر کوئی کمی نہیں آئی۔ انھوں نے ٹھان لیا تھا کہ چاہے جان چلی جائے لیکن اس ملک کو آزاد کرا کے ہی دم لیں گے، تاکہ آنے والی نسل آزاد فضا میں سانس لے اور کسی طرح کا کوئی خوف نہ محسوس کرے۔ ان کے عزم مصمم اور پایۂ استقامت کے سامنے انگریزوں کے قدم لڑکھڑا گئے اور وہ اس ملک سے بھاگ جانے پر مجبور ہوئے۔

بچو! آپ مجاہدین آزادی کی تاریخ ضرور پڑھیں، انہوں نے جس محبت، بھائی چارے اور اخوت و ہمدردی کا پیغام دیا ہے اسے عام کرنے اور اس پر عمل کرنے کی ضرورت ہے، ان کے دکھائے اور بتائے ہوئے راستے پر چل کر ہی ہمارا ملک ترقی کر سکتا ہے، ان کی زندگی کو پڑھ کر ملک و قوم کی ترقی کے لیے کچھ بھی کرنے کا جذبہ آپ میں پیدا ہوگا، پندرہ اگست کے موقع پر اسکولوں میں بہت سے پروگرام ہوتے ہیں جن میں مجاہدین آزادی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے، آپ بھی ان پروگراموں میں حصہ لیں، ملک کی آزادی کے لیے جس اتحاد کا انھوں نے مظاہرہ کیا تھا اسے آج بھی اپنانے کی ضرورت ہے، اس کے بغیر مجاہدین آزادی کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا۔ آپ بھی اتحاد کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھیں، ہر جگہ اس کی ضرورت پڑے گی اور یہی وہ منتر ہے جس کی وجہ سے آپ کامیاب و کامران ہوں گے۔

پیارے بچو! 'بچوں کی دنیا' میں آزادی سے متعلق دو کہانیاں اور سات نظمیں شامل کی گئی ہیں، 'چمن چمن کے پھول' کے تحت آزادی اور وطن سے محبت کے حوالے سے معیاری اشعار دیے گئے ہیں، آپ ان کا ضرور مطالعہ کریں، ان تحریروں کو پڑھ کر ملک کی آزادی سے متعلق آپ کی معلومات میں یقیناً اضافہ ہوگا۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاک خانہ

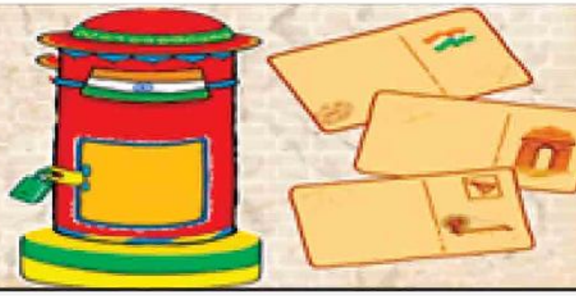

'بچوں کی دنیا' جولائی کا شمارہ موصول ہوا، پڑھ کر قلبی مسرت حاصل ہوئی۔ تمام مضامین قابل مطالعہ اور شاندار ہیں۔ خصوصاً اداریہ اور دوستی اور اس کے تقاضے مضمون نے بہت متاثر کیا۔ ایک اچھے دوست میں کن اوصاف کا ہونا ضروری ہے اس کو بہت ہی اچھے انداز میں پیش کیا ہے۔ محمد رفیع انصاری کی نظم 'بارش رحمت ہے یا زحمت' دل کو چھولینے والی ہے۔ متین الدین احمد کی 'حوصلے کی اڑان' بھی بہت ہی نصیحت آموز اور ترغیب وتحریک دینے والی کہانی ہے۔ فرحان خان کی کہانی 'محنت کا پھل' بھی بہت ہی پرکشش اور دل پر اثر کرنے والی کہانی ہے۔ مختصر یہ کہ تمام مضامین، نظمیں، ڈراما اور کہانیاں بچوں کو ذہن میں رکھ کر لکھی گئی ہیں جو کہ ادبی علمی نفسیاتی، سائنسی اور متاثر کن ہیں جس کے لیے مدیران اور تمام قلمکار کو تہ دل سے مبارکباد

محمد محمود الحسن، بردونی پوسٹ بڑاہی تھانہ بیتھان
ضلع سمستی پور بہار۔ 848207 موبائل:8294653040

رسالہ 'بچوں کی دنیا' دیکھ کر ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوتا ہے یا پھر یوں کہیں کہ ہم اپنے بچپن کی خوبصورت یادوں میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔ بہرکیف ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' جولائی 2023 کا تازہ شمارہ حاصل ہوا جسے پڑھ کر ذہن کے مختلف دریچے کھل گئے اور بیحد مسرت ہوئی۔ یہ رسالہ ہر لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے، اس کی خاص بات یہ ہے کہ یہ بچوں پر خصوصی توجہ دیتا ہے۔ جس میں دلچسپ کہانیاں، خوبصورت نظموں کے ذریعے انھیں علم حاصل کرنے کی طرف گامزن کرتا ہے۔ اس کے علاوہ آنے والے کل کے لیے ان کے ذہن کی تشکیل، جستجو اور امنگ پیدا کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے مطالعے سے ہم مزید نئے علم سے روشناس ہوتے ہیں۔

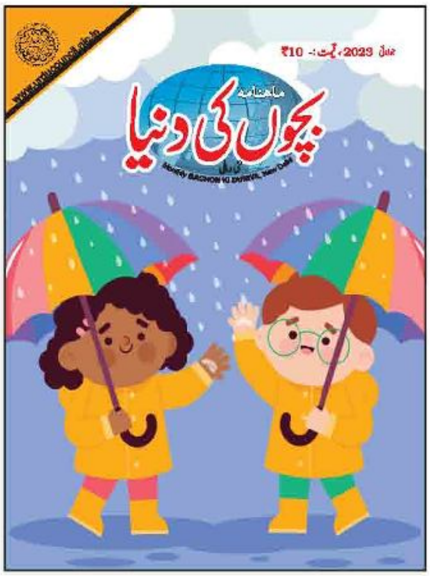

رسالے میں جدید ٹکنالوجی، تاریخ، تہذیب، اہم قلمکاروں کی تخلیقات کے ذریعے کچھ نئی اور دلچسپ باتیں معلوم ہوئیں۔ بچوں کی دنیا ایک خاص اہمیت وانفرادیت رکھتا ہے۔

صوفیہ پروین، محلّہ نگاہی بیگ، پوسٹ سٹی مسجد غازی پوری یوپی 233001

'بچوں کی دنیا' کا تازہ شمارہ موصول ہوا۔ شمارہ پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا، انتہائی خوبصورت جاذب نظر سرورق پر بچوں کی خوبصورت پینٹنگز ان کی معصوم دنیا شمارے کے تمام

قارئین

مضامین بہت ہی عمدہ اور قابل مطالعہ ہیں، خصوصاً دوستی اور اس کے تقاضے، وسیم سعید جاگتی آنکھوں کا خواب، عظیم اقبال بچوں کی نظمیں بھی انتہائی دلکش انداز اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اس کے علاوہ پانی بنا بادل، شرارت سے توبہ، خوبصورت تخلیقات ہیں۔ بچوں کا معصوم فن مصوری قابل دید ہے۔ بچوں کی دنیا کی تخلیق کے لیے اس کے سبھی اراکین مدیران مبارک باد کے مستحق ہیں۔

سرتاج پروین، ویسٹ پیٹ نگر، نئی دہلی، 110008

جون 2023 کا شمارہ دستیاب ہوا۔ سرورق نہایت ہی دلکش اور سبق آموز ہے، یہ کار خیر کی طرف بچوں کو راغب کرنے کی عمدہ کوشش ہے۔ آج کا بچہ عملی طور پر کسی بھی نصیحت کو قبول تبھی کرتا ہے جب اس کے سامنے عملی نمونہ پیش کیا جائے۔ باپ گھر کے درخت ہوتے ہیں، محمد اکرام کا مضمون جسے فادرز ڈے کی مناسبت سے پیش کیا گیا، یہ سلسلہ مزید فروغ چاہتا ہے۔ محمد اکرام نے اپنے مضمون کے ذریعے ایک بیٹی کی طرف سے اپنے والد سے جس محبت کا ثبوت دیا ہے اس پیغام کے سہارے نیک تربیت میں یقیناً مدد ملے گی۔ شاداب شمیم نے جنگل جنگل ڈاکٹر محبوب حسن ہمدم کی تازہ تصنیف کا عمدہ اور آسان زبان میں تعارف کرایا اچھا لگا۔ محمد حفظ الرحمٰن ندوی کا مضمون 'ماحولیات اور ہم' بہترین مضمون ہے۔ نیکی کر دریا میں ڈال، از محمد اسد اللہ کے کیا کہنے، تجربات کی روشنی میں تعلیم کی طرف گامزن کرنے والی عمدہ تحریر ہے۔ نظموں میں عطا عابدی، حبیب سیفی، ناصر الدین ناصر، ممتاز انور، سعدیہ صدف اور شیبا کوثر نے متاثر کیا۔ ننھے فنکاروں کی پینٹنگ سے محظوظ ہونے کا موقع ملا، سبھی بچوں کو مبارکباد۔ میں سمجھتی ہوں بچوں کی دنیا کا شاید ہی کوئی شمارہ ایسا ہو جس میں لائق استفادہ مواد نہ ملتا ہو، بس ذہن و دل کی کھڑکیا کھول کر مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ شجرکاری کی ترغیب دینے کے خوشنما منظر کے لیے قومی اردو کونسل کو ایک مرتبہ پھر سے مبارکباد۔

عالیہ سیفی، حوض رانی، مالویہ نگر، نئی دہلی 110017

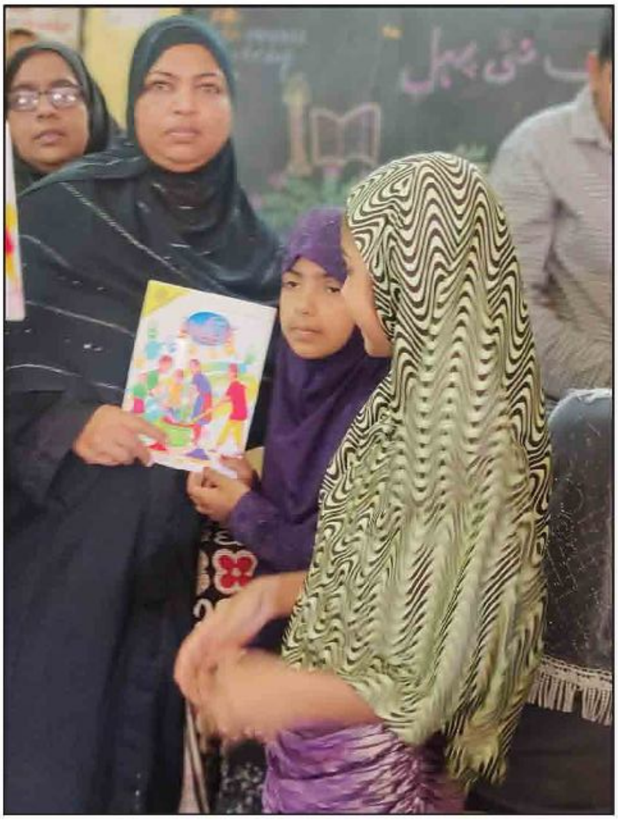

سید غفار سید حسین اردو اسکول، اکولہ، مہاراشٹر

'قومی اردو کونسل کے رسالے میں ہر ماہ پڑھتا ہوں اور مطالعہ کے سبب میری معلومات میں کافی اضافہ ہوا ہے۔ ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' میرے اسکول کے جماعت سوم تا ہفتم کے تمام طلبا/ طالبات بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔ ڈاک خانہ، مضامین، نظمیں، ماحولیات، کہانیاں، سائنس نامہ اور ننھے فنکار ہر ایک عنوان اور مضمون ایک منفرد انداز پیش کش لیے ہوئے ہے۔ طلبا میں اس کے مطالعے سے تخلیقی سوچ پیدا ہو رہی ہے۔

خان محمد یاسر، صدر مدرس، محسن احمد اردو پرائمری اسکول، اورنگ آباد، مہاراشٹر

شفیع الدین نیر

جھنڈا اونچا رہے ہمارا

سب سے اچھا سب سے نیارا
رنگ ترنگا پیارا پیارا
قوم کی امیدوں کا سہارا
دیس دلارا جگ اجیارا
دل کی ٹھنڈک آنکھ کا تارا
جھنڈا اونچا رہے ہمارا

دیس دسا دکھلانے والا
ہوش میں ہم کو لانے والا
جوش سے دل گرمانے والا
خدمت پر اکسانے والا
قوم کی نیّا کھیون ہارا
جھنڈا اونچا رہے ہمارا

آزادی کے پروانوں کو
اس دیوی کے دیوانوں کو
ہندوؤں اور مسلمانوں کو
ہند کے سارے انسانوں کو
ہے یہ اپنی جان سے پیارا
جھنڈا اونچا رہے ہمارا

جب جھنڈا لہرائے گا یہ
من کی جوت جگائے گا یہ
اپنائیت پھیلائے گا یہ
پریت کی ریت سکھائے گا یہ
پریم کا ساگر پریم کی دھارا
جھنڈا اونچا رہے ہمارا

■

ماخذ: منی کا تحفہ، **مصنف:** محمد شفیع الدین نیر، **سنہ اشاعت:** 2019، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

نصرت شمسی

جشن آزادی

ترنگا

نانو پلیز آجایئے۔ میرا لڈو کھانے کا دل چاہ رہا ہے اور لڈو تو آپ ہی لاتی ہیں، پلیز نانو۔

پانچ سال کے عامر نے ویڈیو کال پر ضد ہی پکڑ لی۔

نانو کی جان، نانو نہیں آسکتی ہیں ابھی۔

نانو کے اسکول بھی کھلے ہیں۔ آپ کی طرح چھوٹے چھوٹے پیارے بچے پڑھتے ہیں وہاں، میں پھر آؤں گی۔ پندرہ اگست منانے کے بعد...

اللہ حافظ۔

عامر نے پھر پندرہ اگست کا نام سنا اور سوچنے لگا کہ یہ کیا چیز ہے جو سب کے گھر آرہی ہے۔ سب اسے ساتھ میں منائیں گے۔ کیا ہے یہ؟ اس نے اپنی چھوٹی بہن سے پوچھا۔ تمھیں پتہ ہے یہ کیا ہے؟ منی گڑیا نے نہ کہہ کر سر ہلا دیا۔

سوچتے سوچتے وہ سوگیا۔ شام میں اٹھا تو اس کے ذہن میں پھر نانو کی آواز گونجی۔

میں پندرہ اگست کے بعد آؤں گی۔ ابا بھی کئی دن سے کچھ عجیب عجیب سا گا رہے تھے۔ کیا ہے یہ پندرہ اگست؟

اس نے اپنی اماں سے پوچھا کہ اماں یہ پندرہ اگست کس کا برتھ ڈے ہے؟

اماں جو بریانی کے چاول نکال رہی تھی چونک گئیں اور پھر عامر کو دیکھا۔

میرا چھوٹو سا بیٹا۔ کل بتاؤں گی، بلکہ آپ کو خود ہی پتہ چل جائے گا... انتظار کرو کل کا۔

عامر ناراض ناراض سا سونے چلا گیا۔

صبح گھر کی چہل پہل سے اس کی آنکھ کھلی۔ اس نے دیکھا گھر میں کچھ ہو رہا ہے۔ سب کسی تیاری میں ہیں۔ وہ جلدی سے بستر سے اٹھا اور ابا کی تلاش میں لگ گیا۔

اماں ابا کہاں ہیں؟

کچن میں اماں کو کام کرتے دیکھا تو پوچھ بیٹھا۔

ابا پندرہ اگست کی تیاری کر رہے ہیں جاؤ دیکھو...

پندرہ اگست، تو کیا آج ہے؟ آج نہیں کل ہے پندرہ اگست اور ابا اسی کی تیاری کر رہے ہیں۔ جاؤ دیکھو۔

دونوں بہن بھائی دوڑ کر ابا کے پاس پہنچ گئے۔ ابا جی... دونوں نے چیخ کر ابا جی کو ڈرا دیا، ارے میرے بچے آ گئے، آؤ...

ابا جی کو ترنگا ڈنڈے پر چڑھاتے دیکھ کر دونوں بہن بھائی بھاگے بھاگے ابا کے پاس پہنچ گئے۔

''ارے ابا ترنگا؟

ہمارے گھر ترنگا تھا؟

کہاں رکھا تھا۔ ہمیں کبھی کھیلنے کے لیے کیوں نہیں دیا، دکھایئے مجھے''

عامر نے ایک ساتھ کئی سوال کر دیے۔

امی نے ہنس کے اسے اپنے گلے سے لگایا۔

''بیٹا ایک ایک کر کے... اتنے سارے جواب ایک ساتھ کیسے دیں گے ابا...''

''اماں لیکن یہ ابا ترنگے کے ساتھ کر کیا رہے ہیں؟''

''بیٹا کل پندرہ اگست ہے۔ ہماری آزادی کا دن۔ کل ہم سب جشن منائیں گے اور گھر کی چھت پر یہ ترنگا لہرائیں گے۔''

''کیوں اس میں ایسا کیا ہے جو کل ہی لگائیں گے اور چھت پر لگائیں گے؟''

گڑیا نے ترنگے کی نیلی نیلی تیلیوں کو گننا شروع کیا۔

''یہ پھول کیسا ہے؟''

''ارے میری جان ابھی ذرا اسے ڈنڈے پر چڑھا کر کمرے میں حفاظت سے رکھ دوں۔ کل اس کی کہانی سناؤں گا۔

چلو اب جلدی جلدی بستر پر جاؤ۔ صبح جلدی اٹھنا ہے اور ہاں امی سے پوچھو کپڑے تیار ہیں؟''

''جی ابا'' گڑیا نے جلدی سے کہا۔

''آج شام ہی امی نے مجھے تین رنگ کی چوڑیاں دلائی ہیں۔ میم نے منگوائی تھی۔''

اور ابا میرے کپڑے؟

''وہ بھی تیار ہیں۔'' امی نے جواب دیا۔

''تو چلو شب بخیر، صبح ملتے ہیں...''

صبح کھٹ پٹ کی آوازوں سے عید کا سا دن لگ رہا تھا۔

امی نے جلدی جلدی ناشتہ کرایا۔

اور ابا پھر ترنگا نکال لائے جو ہوا میں آتے ہی لہرانے لگا۔

''کتنا پیارا لگ رہا ہے یہ لہراتا ہوا'' عامر نے گڑیا سے کہا۔

''ہاں چلو بچو چھت پر چلتے ہیں اسے لہرانا ہے...''

''چلیے ابا''

سب چھت پر ترنگا لگانے لگے۔ ابا نے اونچے سے ڈنڈے پر اسے سیدھا کھڑا کر دیا۔ ترنگے کو ہوا نے ایسا لہرایا کہ پھر وہ لہراتا ہی رہا۔ امی نے دونوں بچوں کو جلدی جلدی تیار کیا۔ خود بھی اچھے کپڑے پہنے۔ ابا نے بھی سفید کرتا پاجامہ پہنا اور سب ترنگے کے پاس آ گئے۔ ابا نے موبائل آن کیا ہوا تھا۔ لال قلعہ سب کو نظر آ رہا تھا اور انتظار تھا کہ پہلے وہاں جھنڈا لہرایا جائے گا۔ تھوڑی دیر میں لال قلعہ پر ترنگا بڑی شان سے لہرا رہا تھا۔ ابا نے پھر سب کو جمع کیا اور سارے جہاں سے اچھا... گایا... گڑیا کے ہاتھوں میں ترنگے کے رنگ کی چوڑیاں کھنک رہی تھیں۔

عامر نے سفید کرتا پاجامہ اور ناگرے پہنے تھے۔ اس

کے کرتے کی بائیں جانب ترنگا بیج لگا ہوا تھا۔ ابا بھی ایسے ہی تیار تھے، امی نے سفید سوٹ پر تین رنگوں والا دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ قومی گیت اور ترانے کے بعد سب نیچے آگئے۔ عامر کو یاد تھا کہ ابا نے ترنگے کی کہانی سنانے کو کہا تھا۔

ابا ترنگے کی کہانی...

''ہاں چلو سناتا ہوں...

ہاں تو بیٹا ہمارے ترنگے کی کہانی یہ ہے۔ پہلے ذرا ایک لڈو کھالوں'' انھوں نے عامر کو چڑھایا۔

''ابا...''

عامر نے منھ پھلایا'' ارے مٹھائی کھاؤ بہت خوشی کا دن ہے...''

''سناتا ہوں۔ لو گڑیا لڈو کھاؤ'' ابا نے ایک ایک لڈو دونوں کے منھ میں دیا اور مسکرا دیے۔

''ہاں تو ہوا یہ کہ جب ہم ہندوستانیوں نے اپنے ملک سے انگریزوں کو بھگا دیا تو ایسا لگا جیسے سب کسی جیل سے آزاد ہوئے ہیں، اب سب اپنا ہے۔ بس پھر جشن منانے کا دن آیا اور آزادی کی لڑائی میں شامل لوگوں نے ایک کمیٹی بنائی کہ اب ہمیں اپنے ملک کا نظام بنانا چاہیے۔ ہمارا اپنا پرچم ہو جو ہماری پہچان ہو۔ اس کمیٹی میں مولانا آزاد، گاندھی جی جیسے بہت سے لوگ شامل تھے۔ جھنڈے کا ڈیزائن تیار کیا گیا جو پاس ہو گیا۔ اسے کتنا لمبا اور کتنا چوڑا ہونا چاہیے یہ بھی طے پایا۔ پتہ ہے اس کی لمبائی چوڑائی کیا طے ہوئی؟''

''نہیں ابا''

اس کا شیپ مستطیل والا یعنی ریکٹ اینگل والا ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی 3.2 کے تناسب میں ہوتی ہے۔ اس کا ڈیزائن پنگلی وینکیا نے بنایا۔ اب جب سب کچھ طے ہو گیا تو یہ سوال اٹھا کہ اسے کون تیار کرے گا؟ تو اس کمیٹی میں ایک خاتون بھی شامل تھیں جن کا نام ثریا بدر الدین تھا۔ سب کو پتہ تھا کہ وہ سلائی کڑھائی میں بہت ماہر ہیں۔ سب نے کہا کہ یہ کام ثریا کریں گی۔ اس طرح پہلا جھنڈا ثریا جی نے اپنے گھر اپنے ہاتھوں سے بنایا جسے ہمارے پہلے وزیر اعظم محترم پنڈت جواہر لال نہرو جی پارلیمنٹ لے کر گئے اور یہی جھنڈا وہاں لہرایا گیا، یہ ہے ترنگے کی کہانی۔''

''لیکن ابا اس کے بیچ میں کیا ہے؟''

''وہ... وہ اشوک چکر ہے جس کا مطلب بہادری کا نشان مانا جاتا ہے یعنی ایثار اور قربانی کا نشان۔

اور ہمارے ترنگے کا رنگ کیسا ہے، بتاؤ گڑیا''

ابا نے پوچھا۔

''کیسری بیچ میں سفید اور اس پر یہ اشوک چکر اور نیچے ہرا''

''شاباش، اللہ سے دعا ہے کہ ہمارا یہ ترنگا اپنی آن بان شان سے یوں ہی لہراتا رہے۔''

''آمین!''

فضا میں حب الوطنی کے گیت پھیلے ہوئے تھے۔ کہیں سے 'سارے جہاں سے اچھا' کی آواز آ رہی تھی تو کہیں سے 'جن گن من' کی تو کہیں سے 'اے میرے پیارے وطن' کی صدا بلند ہو رہی تھی ہر طرف خوشیوں کا ماحول تھا۔

امی نے لڈو کے ڈبے لاکر دونوں کو دیے اور بولیں پڑوس میں مٹھائی دے آؤ... بچے خوشی خوشی مٹھائی بانٹنے نکل گئے۔

ابا 'اے میرے پیارے وطن' گاتے ہوئے لڈو کھانے بیٹھ گئے۔

■

Nusrat Shamsi
Anjuman Street
Rampur- 244901 (UP)

تبسم سحر

آزادی کا دن آیا...

آزادی کا دن آیا، آؤ بچو خوشی منائیں
خون پسینہ رنگ لایا، آؤ بچو خوشی منائیں
ٹوٹے پیروں کے بندھن، کودیں، اچھلیں میداں میں
بلا رہی کھلی فضا، آؤ بچو خوشی منائیں
رات اندھیری ختم ہوئی، مشرق روشن ہونے لگا
ہم سے کہے یہ باد صبا، آؤ بچو خوشی منائیں
حبس کی حالت نہیں رہی، اب نہ گھٹے گا کسی کا دم
چلنے لگی ہے تازہ ہوا، آؤ بچو خوشی منائیں
راہ سے کانٹے دور ہوئے، خوں نہ بہے گا پیروں سے
آزادی کا پھول کھلا، آؤ بچو خوشی منائیں
قوم کے متوالے جاگے، دشمن ڈر کر گھر بھاگے
ہوئی قبول اپنی دعا، آؤ بچو خوشی منائیں
اب نہ برے دن آئیں گے، ہم نہ کبھی گھبرائیں گے
حامی اپنا ہوا خدا، آؤ بچو خوشی منائیں
آؤ اسکولوں میں جائیں، ہر اک کو ہم میٹھا کھلائیں
کوئی نہیں ہے ہم سے جدا، آؤ بچو خوشی منائیں
آزادی کے نعرے لگائیں، گاندھی نہرو کو دیں دعائیں
پرچم لہرائے ہرجا، آؤ بچو خوشی منائیں
لکھیں گے اور پڑھیں گے ہم، ہر میداں میں بڑھیں گے ہم
سب سے ہوں گے آگے سدا، آؤ بچو خوشی منائیں
سب کے مسئلے ہوں گے حل، آج نہیں تو ہوں گے کل
لب پہ نہ ہوگا کوئی گلہ، آؤ بچو خوشی منائیں
خوشی میں، غم میں ساتھ رہے، ہاتھ میں ہر دم ہاتھ رہے
اسی سے ہوگا سب کا بھلا، آؤ بچو خوشی منائیں
ہوگی ہمیشہ سچ کی جیت، گائیں مل کر سحر کا گیت
جائے فلک تک اس کی صدا، آؤ بچو خوشی منائیں

■

Tabassum Sahar
12, Novel Heights,
Near Delta Royal, Stavik Nagar
Pakhal Road
Nashik- 422011 (Maharashtra)
Mob.: 8888315125

ظہیر رانی بنوری

آزادی

ہم نے پائی آزادی
خوشیاں لائی آزادی
ہر سو اپنے بھارت میں
دھوم مچائی آزادی
ہر مذہب کے لوگوں کو
گلے لگائی آزادی
پیار محبت الفت کا
پاٹھ پڑھائی آزادی
امن و اماں اور شانتی کی
راہ دکھائی آزادی
نفرت اور عداوت کو
ختم کرائی آزادی
باپو جی کی باتوں کو
پھر دہرائی آزادی
دو اکتوبر باپو کی
یاد دلاتی آزادی

(تعارف جون 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Zaheer Ranebennuri
Mrutyunijaya Nagar, H.No: 1273
Ranebennur- 581115
Distt.: Haveri (Karnataka)

محمد وکیل

خوں بہا کر وطن یہ ملا ہے

آج آزاد بھارت ہوا تھا
جیسے کوئی مکمل جوا تھا
یہ تو قربانیوں کا صلا ہے
خوں بہا کر وطن یہ ملا ہے
تھے مسلمان، ہندو، عیسائی
ذمے داری سبھی نے نبھائی
متحد تھے وہ ہر اک نظر سے
جیسے پھل ہوں وہ اک ہی شجر سے
کتنی برکت تھی اس دوستی میں
خوش تھے سارے ہی اس آشتی میں
جان دو تھے مگر ایک قالب
باہمی ربط کے وہ تھے طالب
جب سے اپنا وطن بٹ گیا ہے
جذبۂ پیار بھی گھٹ گیا ہے
بازیابی کریں پیار کی ہم
دور نہ ہوں، رہیں پھر سے باہم

■

Ahmad Wakeel Aleemi
Doordarshan Kolkata
B.L No4, H. No5
Kankinara-24
Parganas (North) 743126 (West Bengal)

مدثر عمر کیفی

پندرہ اگست

پھر اک
نئی صبح نے دستک دی تو
سبھی کے چہرے پر
مسرت کی لہر دوڑ گئی
سبھی
اک نئے جوش و جذبے کے ساتھ
کیف و مستی کے عالم میں
سرشار ہیں
لبوں پر آزادی کے نغمے
اک نئی امنگ
اک نئے ارادے کے ساتھ
ملک کی فلاح و بہبود کے لیے
متحد ہو کر
سبھی عہد کرتے ہیں
اور شہیدان وطن کو
خراج عقیدت پیش کرتے یں
یہاں نہ کسی کو کسی پر
برتری ہوتی نہ کوئی امتیاز

■

Mudassir Umar Kaifi
Saba House, Daccan Mohalla Piro
Piro- 802207
Bhojpur (Bihar)
Mob.: 8709838916

عذرا خاتون

یہ ہے اپنا ہندوستان

منزل پہ سب اپنی رواں ہیں
بچوں کے اسکول جہاں ہیں
رنگ برنگے پھول وہاں ہیں
چہرے پر سب کے مسکان
یہ ہے اپنا ہندوستان
سڑکوں پر چلتے ہیں راہی
جیسے مل جل کے یکجائی
ہندو مسلم سکھ عیسائی
سب کو دیکھے ایک سمان
یہ ہے اپنا ہندوستان
کوئی دکھائے سینہ زوری
چھل کپٹ ہو اور نہ چوری
چاہے چھورا ہو یا چھوری
سب رکھیں اس دیش کا مان
یہ ہے اپنا ہندوستان
ٹک ٹک کی آواز جو آئی
دیکھو کون ہے آیا بھائی
یہ ہے رانی لکشمی بائی
ہاتھ میں اس کے تیر کمان
یہ ہے اپنا ہندوستان

دھوپ سنہری جب ہٹتی ہے
رات کی رانی تب سجتی ہے
مندر میں گھنٹی بجتی ہے
مسجد میں گونجے ہے اذان
یہ ہے اپنا ہندوستان
جھنڈا اونچا لہک رہا ہے
بچو! جیسے ہمک رہا ہے
دیش تو ایسا چمک رہا ہے
جیسے ہو موتی مرجان
یہ ہے اپنا ہندوستان
غیروں کو بھی تم اپناؤ
سب کو اچھی راہ دکھاؤ
جھنڈا اونچا اور اٹھاؤ
تا کہ توڑے نہ کوئی کمان
یہ ہے اپنا ہندوستان

■

Azra Khatoon
Hasan Makhkha Sani
Mau- 275101 (UP)
Mob.: 8960829824

سید عشقان رہبر

پندرہ اگست

دل سے خوشی منایئے
پندرہ اگست ہے
نغمے وطن کے گایئے
پندرہ اگست ہے

نفرت کی تیرگی کو دلوں سے مٹایئے
ہر اک روش پہ پیار کے دیپک جلایئے
ارض وطن سجایئے پندرہ اگست ہے
دل سے خوشی منایئے پندرہ اگست ہے

ویروں نے جان دے کے بچایا ہے دیش کو
ظالم فرنگیوں سے چھڑایا ہے دیش کو
آزادیاں منایئے پندرہ اگست ہے
دل سے خوشی منایئے پندرہ اگست ہے

گلشن محبتوں کا، بنانا ہے دیش کو
پھولوں سے نوع بہ نوع کے، سجانا ہے دیش کو
بوئے وفا لٹایئے پندرہ اگست ہے
دل سے خوشی منایئے
پندرہ اگست ہے
نغمے وطن کے گایئے
پندرہ اگست ہے

■

Sayyed Ashqan Rahbar
Shaikshak Colony
Chikhli Road, Amdapur
Distt.: Buldana- 444301 (Maharashtra)
Mob.: 9767125832

سید واجد علی شاہ جیلانی

بچو! کسی بھی ملک کی پہچان کے لیے اس کا ایک نشان، پرچم کی شکل میں ہوتا ہے جسے قومی پرچم کہتے ہیں۔ ہمارے عزیز وطن بھارت کا بھی قومی پرچم ہے، اس پرچم کا نام ترنگا ہے۔ یہ ہمارے عزیز وطن کی پہچان کے ساتھ ساتھ آزادی کی لمبی لڑائی کی علامت ہے۔ 22 جولائی 1947 کو پارلیمنٹ میں ترنگے کو قومی جھنڈا تسلیم کیا گیا اور قوم کی آزادی کی پہچان قرار دیا گیا۔ چونکہ قومی جھنڈے میں تین رنگوں کا استعمال ہوا ہے اس لیے اس کا نام ترنگا رکھا گیا ہے۔

قومی پرچم میں تین رنگوں کی پٹیاں ہوتی ہیں جس میں گہرے کیسریا رنگ کی پٹی سب سے اوپر، سفید پٹی بیچ میں اور گہرے ہرے رنگ کی پٹی نیچے کی طرف ہوتی ہے۔ بیچ میں سفید رنگ کی پٹی میں 24 تیلیوں کا چکر بنا ہوتا ہے۔ یہ تینوں پٹیاں سائز میں برابر ہوتی ہیں۔

سب سے اوپر گہرا کیسریا رنگ قربانی، ہمت اور طاقت کی علامت، سفید رنگ امن اور صداقت کی علامت اور ہرا رنگ پیداوار اور کامیابی کی علامت ظاہر کرتا ہے۔ سفید پٹی کے بیچ نیوی بلیو رنگ کا اشوک چکر ظاہر کرتا ہے کہ زندگی حرکت میں ہے اور موت جامد ہے۔ 200 ق م یہ چکر بدھ مذہب کے ماننے والوں کا مذہبی نشان تھا جسے سارناتھ کے اشوک استمبھ سے لیا گیا۔ اس چکر کا قطر سفید پٹی کی چوڑائی کا تین چوتھائی ہوتا ہے۔ پرچم کی لمبائی اور چوڑائی کی نسبت 2:3 کی ہوتی ہے۔

قومی جھنڈے کی تیاری کا کام بیورو آف انڈین اسٹینڈرس (Bureau Indian Standards) نام کی ایک کمیٹی کرتی ہے جو اس کے رنگ، فرما، دھاگا، کپڑا اور پیمائش وغیرہ کے ضابطے کی پابندی کرتی ہے۔ صحیح پیمائش میں ترنگے تیار کیے جاتے ہیں۔

26 جنوری 2002 کو قومی پرچم سے متعلق ضابطہ میں تبدیلی سے اب عام شہری بھی، کہیں بھی اور کبھی بھی قومی پرچم، ذیل کی پابندی کے ساتھ لہرا سکتا ہے:

* جب بھی پرچم کشائی کی جائے تو کیسریا رنگ اوپر ہونا چاہیے۔
* ذاتی یا سیاسی فائدے کے لیے قومی پرچم کا استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

* جہاں تک ممکن ہو آفتاب کے طلوع سے غروب ہونے کے درمیان ہی پرچم کشائی کی جائے۔
* جان بوجھ کر زمین سے نہ چھونے نہ دیا جائے، نہ اس کو فرش پر بچھایا جائے اور نہ ہی اس کے پردے لٹکائے جائیں اور نہ اسے کسی سواری کے اوپر یا دائیں بائیں پردے یا چھتری کی طرح استعمال کیا جائے۔
* قومی پرچم کے اوپر یا دائیں جانب کوئی بھی نشان، ہار، پھول یا کوئی دوسرا جھنڈا یا جھنڈی نہ رکھی جائے۔
* قومی پرچم سے کوئی اور چیز نہ بنائی جائے مثلاً جھولے اور جھنڈی وغیرہ۔
* کسی کاروباری جلوس یا جلسے میں اس کا استعمال نہ کیا جائے۔
* ترنگے کی بے حرمتی پر ایک سال کی سزا اور جرمانہ ہوسکتا ہے۔

ملک کا ایک سچا شہری ہونے کے ناطے ہمارا یہ اولین فرض بنتا ہے کہ ہر حال میں اپنے پرچم کو نہ صرف بے حرمتی سے بچائیں بلکہ اسے اس بلندی پر پہنچانے کے لیے ایسے کام کریں کہ ہمارے عزیز وطن کا نام سارے عالم میں روشن ہو اور ہمارے پرچم کی آن بان شان میں اضافہ ہو۔

آپ کی جانکاری کے لیے بتاتا چلوں کہ 29 مئی 1953 کو ہمارے پرچم ترنگا کو دنیا کے سب سے اونچے پہاڑ 'ماؤنٹ ایوریسٹ' کی سب سے اونچی چوٹی پر لہرایا جاچکا ہے۔ یہ ہی نہیں، 1984 میں ونگ کمانڈر راکیش شرما کے ساتھ خلا میں بھی ترنگا جھنڈا پرواز کرچکا ہے۔

■

Syed Wajid Ali Shah Jeelani
35, Seva Sadan, Block Campus
12 First Floor, Gali No.: 1
Mandawli, Fazilpur
Delhi- 110092
Mob.: 9800972366

انٹرویو

کامکس بچوں کی دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں

س: بچپن کی کون سی باتیں رشوخیاں رشرارتیں اب بھی آپ کو بہت یاد آتی ہیں؟

ج: بچپن کی یوں تو بہت سی باتیں یاد ہیں، جن میں چند کا ذکر یہاں کر رہا ہوں۔ پہلی بات تو وہ کھیل کود ہیں جو بچپن کا اہم حصہ تھے۔ دوستوں اور ہم جولیوں کا خوشگوار ماحول جس میں بڑے ہی پر لطف اور ہنسی و دل لگی کے ساتھ ہمارا وقت گزرتا تھا۔ دراصل وہ بڑی ہی فرصت اور چین وسکون کا وقت تھا کہ اس وقت ہمارے اوپر نہ تو کوئی ذمے داری تھی اور نہ ہی کسی طرح کی فکر دامن گیر تھی۔ اسی لیے ہنسی کھیل میں زندگی گزرتی تھی۔ وہ وقت تھا جب ہماری پڑھائی کی بنیاد بھی پڑی۔ مجھے وہ باتیں اب بھی یاد ہیں جب ہم کھیل کے ساتھ ہی پڑھائی پر بھی دھیان دیتے تھے۔ دوستوں کے ساتھ پڑھائی لکھائی کی بھی باتیں ہوا کرتی تھیں۔ کتابیں، رسالے بھی پڑھا کرتے تھے۔ خوش خطی، شعر وشاعری اور تقریروں کا مقابلہ ہوتا تھا۔ ان میں ہمارے اساتذہ کی نگرانی بھی رہتی تھی اور ان سے بہت کچھ سیکھنے کو ملتا تھا۔ وہ خوبصورت یادیں آج بھی میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔

س: بچپن میں آپ کے پسندیدہ مصنفین کون تھے اور اب کون ہیں؟

ج: بچپن سے ہی مجھے پڑھنے، لکھنے کا شوق تھا۔ اس وقت میرے پسندیدہ مصنفین میں مائل خیر آبادی، شفیع الدین نیّر، حامد اللہ افسر، ڈاکٹر ذاکر حسین، سراج انور، مرتضیٰ ساحل تسلیمی، سطوت رسول، کیف رحمانی وغیرہ تھے۔ ان کی کہانیاں اور نظمیں ہلال، نور اور کھلونا میں پڑھا کرتے تھے۔ انھی سے کتابیں پڑھنے کا شوق ہوا، جو بڑھتا ہی گیا۔ آگے چل کر مولانا آزاد، علاّمہ اقبال، مولانا حالی، شبلی نعمانی، مولانا مودودی، عبدالحلیم شرر، کرشن چندر، ماہر القادری، شوکت تھانوی، پطرس بخاری وغیرہ کی بھی کتابوں کا مطالعہ کرنے لگا۔ اور یہ بھی میرے پسندیدہ ہیں کہ ان کی کتابوں سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا ہے۔

عاکف سنبھلی

س: بچپن میں بچوں کے کون سے رسائل پڑھتے تھے؟

ج: اس وقت الحسنات گروپ کے بچوں کے رسالوں 'ہلال' اور 'نور' کی بڑی مقبولیت تھی۔ مجھے بھی رسالے پڑھنے کا شوق انہی سے ہوا۔ ان کے ساتھ ہی کھلونا، جنت کا پھول، اچھا ساتھی اور ہندی میں چمپک، لوٹ پوٹ، مدھومسکان بھی پڑھا کرتا تھا۔ اس وقت ہمارا ایک گروپ تھا۔ ہم سب آپس میں مل کر رسالے خریدتے اور باہم ایک دوسرے سے بدل بدل کر پڑھ لیا کرتے تھے۔ اس طرح زیادہ بار بھی نہ پڑتا تھا اور بہت سے رسالے پڑھنے کو مل جایا کرتے تھے۔ اس طرح اپنے ذوق کی تسکین کر لیتے تھے۔ ہر ماہ نئے شمارے کا انتظار

اس قدر بے چینی و شدّت سے رہتا تھا جس کا بیان تحریر سے باہر ہے۔ اس کا اندازہ تو وہی لگا سکتے ہیں جن کو یہ شوق رہا ہو۔

س: بچوں کے ذہنی اور فکری ارتقا کے لیے کون سی کتابیں زیادہ مفید ہیں؟

ج: بچوں کے لیے آسان زبان اور پُر لطف انداز میں لکھی ہوئی کتابوں کا پڑھنا ہی بہتر اور مفید ہوتا ہے۔ اب چونکہ بدلتے ماحول اور عصری تقاضوں کے زیرِ اثر کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ بچوں کو سائنسی اور ریاضی کی کتابیں بھی پڑھنے کے لیے دی جائیں مگر میرے خیال میں بچے ان کو پڑھنا کم ہی پسند کرتے ہیں کیونکہ یہ خشک اور اکتا دینے والے مضامین ہیں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ سائنسی موضوعات کو قصے، کہانیوں اور کارٹون کی شکل میں پیش کیا جائے تو بچے ان کی طرف راغب ہو سکتے ہیں اور ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ اسی طرح قواعد اور انشا کی کتابوں کو بھی پڑھنے کی ترغیب دلائی جاسکتی ہے۔ ورنہ اصلاحی نقطۂ نگاہ تو زبانی طور پر سمجھانے یا ان کے سامنے عملی نمونہ پیش کرنے سے ہی زیادہ ممکن ہوسکتا ہے۔

س: زبان و بیان کو بہتر بنانے کے لیے کن مصنفین کی کتابیں بچوں کے لیے رہنما ثابت ہوسکتی ہیں؟

ج: زبان و بیان کو بہتر بنانے کے لیے بچوں کو قواعد و انشا کی کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے مگر اس کے لیے اساتذہ کی نگرانی ضروری ہے کہ بچے خود اپنے طور پر ان کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ خود اپنے طور پر تو وہ قصے، کہانیوں کی کتابوں سے ہی یہ چیزیں سیکھ سکتے ہیں۔ ہمارے یہاں بہت سے ایسے مصنفین ہیں جنھوں نے ان باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان میں ڈاکٹر بانو سرتاج، قدسیہ بانو، وکیل نجیب، مائل خیر آبادی، غلام حیدر، مرتضٰی ساحل، مولانا اسماعیل میرٹھی، حامد اللہ افسر، شفیع الدین نیّر سرفہرست ہیں۔ ان کی کتابوں سے بچے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ بالخصوص بانو سرتاج اور وکیل نجیب کا اس سلسلے میں اچھا کام ہے۔

س: مستقبل اور اپنے کیریئر کو سنبھالنے کے لیے بچوں کو کن موضوعات کی کتابیں پڑھنی چاہئیں؟

ج: بچے قصّے، کہانیاں، لطیفے اور نظموں کی کتابیں تو پڑھتے ہی ہیں اور یہ ان کے مزاج و مذاق کے بھی مطابق ہوا کرتی ہیں۔ ان کے ساتھ ہی ان کو مذہبی، اخلاقی اور علمی و سائنسی کتابیں بھی پڑھنا چاہئیں کیوں کہ کتابیں پڑھنے کا مقصد جہاں تفریح اور دل بہلانا ہوتا ہے وہیں ان سے معلومات بھی حاصل کرنی چاہئیں اور اس کے لیے ان کو سائنسی اور معلوماتی کتابیں پڑھنا ہوں گی۔ ایسی کتابوں سے ہی ان کی معلومات میں اضافہ ہوگا، ان کی شخصیت نکھرے گی اور یہ معلومات ان کی آئندہ کی زندگی میں کام بھی آئیں گی۔ اس طرح ان کا مستقبل بھی روشن ہوگا اور کیریئر بھی بنے گا۔

س: اپنے سوانحی اور تعلیمی کوائف کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج: میرا نام رضاء الرحمٰن ہے، عاکف میرا قلمی نام ہے، تاریخ پیدائش یکم جنوری 1962 ہے، والد صاحب کا نام شریف الرحمٰن ہے، تجارت پیشہ خاندان سے میرا تعلق ہے۔ سنبھل وطن ہے، ابتدائی تعلیم مقامی اداروں میں حاصل کی۔ دسویں کلاس ہند انٹر کالج سے پاس کرنے کے بعد حفظِ قرآن کے لیے دینی مدارس کی طرف رجوع کیا۔ 1985 میں غالب اکیڈمی دہلی سے خوش نویسی کی سند حاصل کی۔ 1987 میں روہیل کھنڈ یونیورسٹی سے ایم اے اور 2003 میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد سے ہی مقامی ڈگری کالج میں اردو کی تدریسی خدمات انجام دے رہا ہوں اور ساتھ ہی تخلیقی و تصنیفی سلسلہ بھی جاری ہے۔

س: آپ کو بچوں کے لیے لکھنے کا خیال کب اور کیسے آیا؟

ج: میں ابتدائی طور پر بچوں کا ہی ادیب ہوں۔ پہلے میں نے بچوں کے لیے ہی کہانیاں، مضامین اور نظمیں لکھی ہیں۔

رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی کی کتابوں کا عکس

دراصل دیگر اور مشاغل کی طرح تصنیف و تالیف بھی انسان کے مزاج پر منحصر ہوتا ہے اور اچھا ادیب و شاعر وہی ہوتا ہے جس کی سرشت میں یہ جراثیم ہوتے ہیں۔ میری طبیعت ہمیشہ ہی لکھنے پڑھنے کی طرف راغب رہی ہے، اس لیے میں فطری طور پر مصنف ہوں۔ چونکہ بچوں سے بہت مانوس ہوں اس لیے بچوں کا ادیب ہوں۔ خالص بچوں کے ادب پر اب تک میری 20 کتابیں آچکی ہیں اور تقریباً 200 مضامین و نظمیں طبع ہوچکی ہیں۔

س: آپ کے مرکزی موضوعات کیا ہیں؟

ج: میرے مرکزی موضوعات میں بچوں کی اخلاقی و ذہنی تربیت سرفہرست ہے اور اسی کے پیش نظر میں مضامین و نظمیں تحریر کرتا ہوں۔ میرے اکثر مضامین میں اردو زبان کی رغبت، کردار سازی اور تعلیم سے محبت کا درس ملتا ہے۔ اسی طرح نظموں میں بھی اکثر میری کوشش یہی رہا کرتی ہے کہ ہر نظم بلکہ نظم کے ہر شعر میں بچوں کے لیے کوئی نہ کوئی پیغام ضرور ہو۔ جیسے حب الوطنی، انسان دوستی، علم حاصل کرنا اور خدمت خلق میری تحریروں کے خاص موضوع ہیں۔ دراصل میرا نظریہ یہ ہے کہ ادب محض وقت گزاری یا تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ اس سے ہمیں بہت کچھ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اسی لیے میری اوّلین کوشش یہی ہوتی ہے کہ میری تخلیقات سے بچوں کی تربیت بھی ہو اور وہ ان کی کردار سازی کا ذریعہ بھی بنیں۔

س: کتاب لکھنے سے پہلے آپ بچوں کی نفسیات اور ذہنی مطالعات پر ریسرچ کرتے ہیں یا نہیں؟

ج: لکھتے وقت بچوں کی نفسیات کا مطالعہ ہی نہیں بلکہ بچوں کی نفسیات میں اترنا پڑتا ہے، ان کو پڑھنا پڑتا ہے۔ یعنی خود ہی بچہ بننا پڑتا ہے۔ دراصل شاعر یا ادیب تب ہی کامیاب ہوتا ہے جب وہ اپنے موضوع میں پوری طرح ڈوب کر لکھتا ہے۔ اپنے مخاطب کی نفسیات کو سمجھتا ہے اور اس کے مذاق و مزاج کو مدّ نظر رکھتے ہوئے لکھتا ہے۔ اب لکھتے لکھتے اتنا تجربہ تو ہو ہی چکا ہے کہ بچوں کی نفسیات کو پڑھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی بلکہ خود بچپن ہی ہم پر قابض و مسلّط ہوگیا ہے اور اسی کیفیت کے زیر اثر ہمارا قلم چلا کرتا ہے۔

س: ادیب اطفال کی حیثیت سے ادبی اور علمی حلقوں میں آپ کی قدر ہوتی ہے یا نہیں؟

ج: مجھے اس بات کی بہت خوشی ہے کہ دوستوں، قدردانوں اور دیگر حضرات کی جانب سے پذیرائی، عزت افزائی اور خوب محبت ملی اور یہ عزت ہی میرے لیے عظیم سرمایہ ہے۔ قلم و قرطاس کا یہ رشتہ ہی تو ہے جس کی وجہ سے مجھ کو ملک گیر شناسائی اور شہرت و عزت حاصل ہوئی ہے۔ میرے تخلیقی کام کو مختلف اداروں اور اکادمیوں کی جانب سے بھی خوب نوازا گیا۔ 2014 میں اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ کے ہاتھوں سے ایوارڈ حاصل ہوا اور 2018 میں اتر پردیش اردو اکادمی سے ہی

گراں قدر ادب اطفال ایوارڈ سے بھی سرفراز کیا گیا۔ جو میرے لیے باعثِ صد افتخار ہے۔

س: انگریزی اور دیگر زبانوں میں شائع ہونے والے کون سے رسالے بچوں کے لیے مفید ثابت ہوسکتے ہیں؟

ج: ہر ایک زبان کا اپنا الگ ہی مزاج و منہاج ہوا کرتا ہے۔ اب کچھ حضرات انگریزی زبان کے غلبے کی وجہ سے اس کا رُعب خود پر غالب کر لیتے ہیں اور ہر چیز کو اس کے معیار پر ناپنے لگتے ہیں اور انگریزی کو ہی سب کچھ سمجھنے لگتے ہیں۔ جبکہ اس سلسلے میں میری رائے یہ ہے کہ انگریزی زبان فنّی و علمی اعتبار سے تو بہت کچھ ہے مگر ادب و نصائح اور مذہب و اخلاق میں اردو زبان کسی طرح بھی کسی دوسری زبان سے کم نہیں ہے۔ آج بھی اردو کی نظمیں، قصّے، کہانیاں اور حکایتیں اپنی مثال آپ ہیں۔ ہاں کچھ باتوں میں اگر انگریزی رسالوں کی تقلید کر لی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

س: کیا اردو میں بچوں کے لیے انگریزی، تیلگو اور دیگر زبانوں جیسا شائع ہونے والا کوئی مکمل رسالہ موجود ہے؟

ج: میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں کہ اردو کو دوسری زبانوں سے تقابل کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس وقت اردو کے لیے حالات کچھ حد تک تشویشناک ہونے کے باوجود آج بھی اچھے رسالے موجود ہیں جن میں بچوں کی دنیا، امنگ، ہلال، روشن ستارے، پھول، گل بوٹے، پیامِ تعلیم، باغیچہ اور اچھا ساتھی قابلِ ذکر ہیں۔ دراصل مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت اردو میں رسالے تو موجود ہیں مگر ان کے پڑھنے والوں کی تعداد دن بہ دن گھٹتی جا رہی ہے۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ان رسالوں کو پڑھنے کے لیے ننھے قارئین پیدا کیے جائیں۔ جن پر ان رسائل کے ساتھ ہی خود اردو زبان کی بھی بقا و سلامتی کا انحصار ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں پوری طرح سنجیدہ ہونا ضروری ہے۔

س: بچوں کے ادب پر جو رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ ان کے مواد اور زبان و بیان سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

ج: بچوں کے رسالوں سے تو مطمئن ہوں مگر پڑھنے والوں کی دن بہ دن کم ہوتی جا رہی تعداد باعثِ تشویش ہے۔ اور یہ خدشہ اب دامن گیر ہے کہ ہماری نسل نو کو اردو کی جانب راغب نہ کیا گیا اور ان رسالوں سے نہ جوڑا گیا تو آئندہ وقت میں ہمارے ادبی و علمی اثاثے کا کیا ہوگا؟ شکر ہے وطن عزیز کے کچھ حصوں مالیگاؤں، مہاراشٹر، کرناٹک، تلنگانہ اور بھٹکل وغیرہ سے اس سلسلے میں حوصلہ افزا اطلاعات مل رہی ہیں۔ کاش ملک کے دیگر علاقوں کے حضرات بھی اس سلسلے میں سنجیدگی کا مظاہرہ کریں اور اپنے نونہالوں کو اردو زبان، اس کے رسالوں اور کتابوں سے قریب کریں۔

س: معاصر ادب اطفال سے کس درجہ مطمئن ہیں؟

ج: ادب اطفال سے تو پوری طرح مطمئن ہوں۔ لیکن بچوں میں اردو قارئین کی کم ہوتی جا رہی تعداد سے بہت تشویش ہے۔ آج کے دور میں اردو اسکولوں، اردو مضمون اور اردو کتابوں و رسالوں سے دور ہوتے جا رہے بچوں سے خدشہ یہ ہے کہ اردو سے ان کی عدم توجہی کہیں اس پیاری زبان اور اس کے رسائل و کتب کے ختم ہو جانے کی وجہ نہ بن جائے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم لوگ اس سلسلے میں پوری طرح سنجیدہ ہوں۔ بچوں کے والدین، اساتذہ اور سماج کے ذمے داران بچوں کو اردو زبان کی تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ کریں۔ اس زبان کے رسالے اور کتابیں پڑھنے کا رجحان اور شوق پیدا کریں۔ اس کے ساتھ ہی اردو کے قلم کار اور محبین اردو بھی نئی نسل کو اردو سے قریب کریں اور نئی نسل تک اس زبان کو پہنچانے کا فرض ادا کریں۔

س: بچوں کے لیے لکھتے وقت آج کے دور میں کن موضوعات پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے؟

ج: آج بچے چونکہ کتابوں اور رسالوں سے دور ہوتے جا رہے ہیں اس لیے بچوں کو ان کی طرف راغب کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بچوں کی نفسیات اور موجودہ ماحول کے مطابق ہی لکھا جائے۔ یعنی ہمارے قلم کار انہی موضوعات پر قلم اٹھائیں جن کو بچے دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔ آسان، پرلطف اور مزیدار قصے کہانیوں اور نظموں کے ساتھ ہی معلوماتی اور سائنسی کتابیں بھی لکھیں۔ کارٹونی کہانیاں تیار کریں۔ نئے انداز کے کامکس بچوں کی دلچسپی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ یہ سب کام نہایت آسان اور دلچسپ انداز پر کیا جائے تاکہ بچے اس کو پڑھنے میں دلچسپی لیں اور رسالوں، کتابوں سے ان کا رشتہ استوار ہو سکے۔

س: بچوں کی تربیت کے لیے کچھ مفید تجاویز ومشورے؟

ج: بچوں کی تربیت تو والدین، اساتذہ اور ہم قلم کاروں کا اہم فریضہ ہے۔ اس لیے پورے معاشرے پر یہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنے اپنے طریقے پر بچوں کی اخلاقی تربیت کریں۔ اس کے لیے ان کے سامنے خود ہمارا کردار آئیڈیل ہو سکتا ہے۔ مناسب ہدایات، تعمیری رجحانات، بھرپور توجہ، کتابوں کی نشان دہی اور خود ہماری رہنمائی ان کی تربیت کا بہترین طریقہ ہے۔ اس سلسلے میں جہاں ہم قلم کاروں کی ذمے داری ہے کہ بچوں کے لیے صالح لٹریچر تخلیق کریں، وہیں ان کے والدین اور اساتذہ کا بھی یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اس لٹریچر کو پڑھنے کے لیے بچوں کو آمادہ کریں۔ اس طرح جہاں ایک طرف بچوں کی صحیح تربیت ہوگی وہیں دوسری جانب ہماری زبان اور ہمارا ادب بھی نئی نسل تک منتقل ہوگا۔

س: 'بچوں کی دنیا' میں آپ کس نوع کی تبدیلی چاہتے ہیں؟

ج: مجھے اچھی طرح یاد ہے جب بچوں کی دنیا کی اشاعت عمل میں آئی تھی اس وقت اس رسالے میں کچھ ایسے موضوعات بھی تھے جو اس کو اردو کے دیگر رسائل سے الگ کرتے تھے۔ اس طرح اس میں ایک خاص انفرادیت تھی۔ لیکن جیسے جیسے وقت آگے بڑھتا رہا یہ بھی روایتی شکل اختیار کرتا گیا۔ بہتر یہ ہے کہ انھیں موضوعات جیسے ہنسی کے غبارے، کارٹونی کہانی، اردو فیس بک وغیرہ کو اس میں جگہ دی جائے تاکہ اس کی انفرادیت برقرار رہے۔ اور ہمارے بچے اس کی جانب راغب ہوں۔

س: بچوں کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

ج: ایک قلم کار اور خادم اردو ہونے کی حیثیت سے بچوں کو یہ پیغام دینا چاہوں گا کہ وہ اردو جیسی شیریں زبان جو ہماری تہذیب بھی ہے، کو اچھی طرح پڑھیں۔ اس کے رسالوں اور کتابوں کو پڑھیں۔ اس طرح ہماری تہذیب تو زندہ رہے گی ہی خود ان بچوں کی زبان وشخصیت میں بھی نکھار آئے گا۔ زبان میں مٹھاس پیدا ہوگی، تلفظ درست ہوگا۔ کیونکہ اردو زبان صحیح طرح سے جاننے والے ہی اس کے حروف کی صحیح ادائیگی کر سکتے ہیں۔ جس سے ان کے لہجے میں کشش، بیان میں لطافت، گفتگو میں حسن اور بات کہنے کا شعور وسلیقہ آتا ہے۔ تبھی تو شاعر نے کہا ہے۔

وہ اردو کا مسافر ہے یہی پہچان ہے اس کی
جدھر سے بھی گزرتا ہے سلیقہ چھوڑ جاتا ہے

اس لیے عزیز بچو! آپ کو چاہیے کہ اردو پڑھیں اور اپنے دوستوں کو بھی اردو کے رسالوں اور کتابوں سے قریب لائیں، تاکہ ہمارا یہ قیمتی سرمایہ ضائع ہونے سے محفوظ ہو جائے اور ہم اپنے بزرگوں کی اس امانت کے سچے محافظ بن جائیں۔

(تعارف فروری 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Razaur Rahman Akif Sambhali
Miyan Sarai, Katra Bazar
Sambhal - 244302 (UP)
Mob:9990661282

پاپا کیا سوچیں گے

عظیم اقبال

کردار:

(1) چڑنداس، عمر 20 سال،

حلیہ: دبلا جسم، چہرے پر ہلکی داڑھی، مونچھیں

لباس: نیلی جنس، گھٹنوں پر مسکی ہوئی سرخ شرٹ، گلے میں چھینٹ دار اسکارف

(2) دارا سنگھ، عمر: 50 سال

حلیہ: فربہ جسم، بھرا بھرا چہرہ، داڑھی مونچھیں

لباس: میلی سفید دھوتی، شکن آلود زردی مائل کرتا، سر پر زعفرانی پگڑی، کمر کے گرد انگوچھا لپٹا ہوا۔

(3) بکرم ساؤ (چڑنداس کے والد)

(اسٹیج پر نمودار نہیں ہوتے۔ عقب سے ان کی کبھی کبھی کراہیں اور چڑنداس کو پکارنے کی آوازیں آتی ہیں)

(4) رادھا (دارا سنگھ کی اہلیہ)

(اسٹیج پر نہیں آتیں)

پردہ اٹھنے پر کھلی سڑک کا پس منظر، ایک پریشان حال نوجوان (چڑنداس) یہاں وہاں گھومتا دکھائی دیتا ہے۔ عقب میں کتے بھونکتے ہیں۔ کہیں دور سے جنریٹر چلنے کی مدھم آواز آتی ہے۔ اکا دکا کوے کاؤں، کاؤں کرتے ہیں۔

چڑنداس: (اسٹیج کے وسط میں آکر رکتا ہے)

کیا کروں؟ کسے پکاروں؟ کسے آواز دوں؟ کس سے مدد مانگوں؟ ایشور، ہے ایشور! میرے ایشور تو ہی مدد کر۔ میری آواز سنتا کیوں نہیں؟ کہاں چھپا بیٹھا ہے۔

(ہتھیلی پر تمباکو ملتا ہے، پھر منھ میں ڈال لیتا ہے، پینٹ کے عقبی جیب سے موبائل نکالتا ہے۔ کوئی نمبر ملانے کی کوشش کرتا ہے)

ایشور کا نمبر کیا ہوگا بھلا! کسی سے پوچھ بھی تو نہیں سکتا؟ کوئی مددگار نہیں!

(عقب میں قہقہے)

ہیلو! ہیلو!

(سر جھٹکتا ہے۔ موبائل کان سے لگائے رہتا ہے۔ عقب میں کتے بھونکتے ہیں)

(یکا یک چونک کر دائیں جانب دیکھتا ہے)

(آنکھوں کو سکوڑتا ہے۔ کتوں کے تیز بھونکنے کی آوازیں)

(عقب میں، بکرم ساؤ کی کراہ)

چرنداس! او، چرنداس!

داراسنگھ: (آمد) ارے تم ہو! تم؟ کہیں دیکھا ہے تمھیں! کہاں دیکھا ہے؟ کب دیکھا ہے؟ کیسے دیکھا ہے؟

(ماتھے پر ہاتھ ملتا ہے)

(کچھ سوچتے ہوئے) تمھیں دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو، تم جیسے بہت دیکھے ہیں، ایک نہیں کئی دیکھے ہیں۔ انھی میں سے کوئی ہو گے! غلط کہہ رہا ہوں کہ صحیح، بولو—

(تصدیق چاہتا ہے)

چرنداس: کچھ کیا، بہت کچھ کہہ سکتا ہوں! کیا کیا کہوں؟ کتنا کہوں؟

داراسنگھ: (جھنجھلا کر) ... تو کہتے کیوں نہیں؟ کہو...

چرنداس: اچھا! کہتا ہوں! (حلق صاف کرتا ہے)

(بولنے کی کوشش کرتا ہے، لیکن آواز نہیں نکلتی)

داراسنگھ: پریشان ہو؟ کسی الجھن میں ہو؟ کیا ہوا ہے؟ بھوک لگی ہے؟ پیاسے ہو؟ تھکے ماندے ہو؟ کیا بات ہے؟

چرنداس: (چپ چاپ اسے تکتا ہے)

داراسنگھ: مسافر ہو؟ راہ گیر ہو، جو بھی ہو جو کوئی بھی ہو، جہاں ہو وہیں رہو!

چرنداس: (چونک کر) یہاں کیوں رہوں؟ میرا گھر نہیں ہے کیا؟ بے گھر نہیں ہوں! گھر نہیں جاؤں گا کیا؟

داراسنگھ: ہوگا! ضرور ہوگا۔ کیوں نہیں ہوگا! گھر جاؤ گے۔ ضرور جاؤ گے! چلو، جاؤ...

چرنداس: ہوگا نہیں، ہے! بالکل ہے! جاؤں گا... ضرور جاؤں گا۔

(عقب سے بکرم ساؤ کی پکار)

چرنداس!

چرنداس: (چونکتا ہے، لیکن بولتا نہیں)

داراسنگھ: میرے کہنے کا مطلب وہ ایک دم نہ تھا، جو تم سمجھ گئے؟ اخبار والے تو نہیں ہو؟ بولو... تھمتا ہے)

(عقب میں قہقہے)

داراسنگھ: اب ہتک عزت کا مقدمہ مت ٹھونک دینا۔ آدمی کا کیا بھروسہ ایک ہتھے سے اکھڑ جائے!

چرنداس: (ناراضگی سے) اتنا فالتو نہیں... نہ پالتو ہوں کہ کیس مقدمہ کرتا پھروں! کورٹ کچہری کے چکر لگاؤں، وکیل کروں... پیش کار کو پکڑوں...

(عقب سے قہقہے)

چرنداس: فصل کی کٹائی باقی ہے! کھیت، کھلیان سے اناج سمیٹنا ہے، گھر پہنچانا ہے— بیڑیاں بھرتی ہیں۔ اُدھر پاپا... اوہ، پاپا!

(عقب سے بکرم ساؤ کی آواز)

چرنداس!

داراسنگھ: حوالدار ہو کہ جمعدار، منشی ہو کہ پٹواری— سب سے ہول آتا ہے— صورت دیکھ لوں تو بھوک لگے نہ پیاس! (رکتا ہے) خیر! بولو، بھوکے ہو؟ اگر ہو تو میرے ساتھ آؤ، چاہو تو قدم قدم ملا کر چلو۔ چاہو تو قدم قدم پیچھے پیچھے چلو۔ میرا گھر وہ رہا وہ (ایک جانب دیکھتے ہوئے اشارہ کرتا ہے، دیکھو، وہ دیکھو، رادھا گائے دوہنے جا رہی ہے۔ بالٹی اٹھائے چلی آ رہی ہے۔

(عقب سے گائے کی ڈکار کی آواز)

چلو، اٹھو، کھا پی لینا، جو روکھا سوکھا ہوگا، وہی ملے گا۔ ابھی گھر کے راستے میں ہوں۔ چلو، اٹھو— شرم نہ کرو!

(چرنداس کو اٹھنے میں مدد کرتا ہے)

(عقب سے بکرم ساؤ کی آواز)

اوئے پُتر! چرنداس

چرنداس: (آنکھیں سکوڑ کر باہر کی جانب دیکھتا ہے)
کیا آپ کو سڑک کے کنارے ایک الٹی ہوئی گاڑی نظر نہ آئی؟

دارا سنگھ: (خفگی سے) اِدھر اُدھر نہیں دیکھتا۔ (رک کر) ناک کی سیدھ میں چلتا ہوں اور ناک کی سیدھ میں دیکھتا ہوں (رکتا ہے) گاڑی، واڑی ناک کی سیدھ میں آتی تو دیکھ لیتا۔ ظاہر ہے نہیں دیکھا۔ اگر نہیں دیکھا تو کیا ہوا؟ (سر جھٹکتا ہے)
خیر آؤ— کچھ کھالو، کچھ پی لو— مجھے بھی بھوک لگی ہے۔ یہی میرے کھانے کا وقت ہے!

چرنداس: (شکریہ آپ کا) لیکن پاپا کو شاید یہ پسند نہ آئے۔ میری گاڑی الٹ گئی ہے...

(عقب سے بکرم ساؤ کی آواز)

پُتر، چرنداس!

دارا سنگھ: برخوردار! کھا، پی لو۔ پھر گاڑی بھی سیدھی ہو جائے گی۔

چرنداس: (بات کاٹ کر).. لیکن پاپا اسے پسند نہ کریں گے۔

(دونوں باہر جاتے ہیں)

(عقب میں کتے بھونکتے ہیں)

پردہ

وقفہ

ہلکی موسیقی

پردہ اٹھتا ہے

دوسرا منظر

چرنداس: (پیٹ پر ہاتھ پھیرتا ہے)
(رک کر ڈکاریں لیتا ہے)
کچھ زیادہ کھالیا شاید! آپ ٹھیک کہتے تھے چاچا! میں بھوکا تھا! بہت بھوکا تھا!

دارا سنگھ: (مسکرا کر) برخوردار! تم سے زیادہ تو میں نے کھایا۔ پھر بھی لگتا ہے کچھ کھایا ہی نہیں (رک کر) تم نے کھایا ہی کیا؟ (خفگی سے) ڈٹ کر کھایا کرو۔ کھاتے وقت نوالے مت گنا کرو! بھوکے رہو گے تو محنت نہ کر پاؤ گے۔ سدھ، بدھ کھو دو گے...

چرنداس: چاچا! میں نے کم نہیں کھایا۔ اتنا کھا پی لیا کہ نیند آنے لگی— لیکن سو گیا تو پاپا کو الجھن ہوگی! کیا سوچیں گے پاپا!

دارا سنگھ: احمق! نیند آئے گی تو سوؤ گے کیوں نہیں؟ تمہارے سونے سے تمہارے پاپا کو کیوں الجھن ہوگی؟ انھیں میں کہہ دوں گا— کچھ نہ بولیں گے۔ کہاں ہیں تمہارے پاپا؟

چرنداس: (جماہی لیتا ہے)
(جھجک کر) وہ... وہ... اناج سے بھری الٹی گاڑی کے نیچے ہیں! سڑک پر، نہیں، نہیں کھیت میں ہیں!

دارا سنگھ: کیا کہا؟ (منھ کھلا ہے)

چرنداس: جو کہا ٹھیک کہا!

(نگاہ جھکی ہے)

(عقب سے قہقہے)

پردہ

■

Azim Iqbal
Adabistan,Ganj-I,Bettiah - 845438
Mob. 9006502649

عبدالودود انصاری

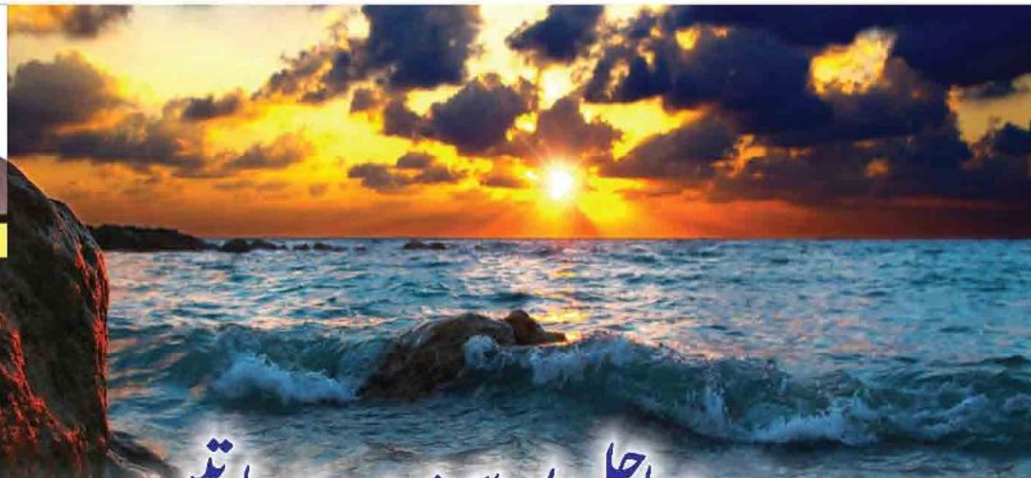

نظم

ساحل اور سمندر سے باتیں

کیسی کیسی باتیں اس کی
کیسی کیسی گھاتیں اس کی
تم بھی سن لو میں بھی جانوں
سیپ، سنکھ، موتی، خوشتر
شارک، وھیل، سامن بہتر
گیس، تیل بھی اور دیگر
کیا کیا ہے اس کے اندر
تم بھی سن لو میں بھی جانوں
آتش اس کے اندر لاوا
آئس برگ ہے اوپر اس کا
گرم ابلتے چشمے اس کے
طوفاں بارش اولے جس کے
تم بھی سن لو میں بھی جانوں
مچھلی کا ہے بڑا ذخیرہ
دھاتوں کا ہے بھنڈارہ
پانی ہے نمکین بہت
نیلا بھی سنگین بہت

تم بھی سن لو میں بھی جانوں
سورج اس میں ڈوبا جائے
صبح سویرے پھر سے آئے
عاشق ہے مہتاب بھی اس کا
کھارا ہے تو آب بھی اس کا
تم بھی سن لو میں بھی جانوں
سرفنگ اس پر، کشتی رانی
قدرت کا نایاب یہ پانی
خطرہ بھی اس میں ہوتا ہے
ڈوبا وہ جو من کھوتا ہے
ہے ودود کی سچی بات
تم بھی سن لو میں بھی جانوں
تم بھی سن لو میں بھی جانوں

نوٹ: سرفنگ(Surfing): سمندر کی سطح پر کھیل کھیلنا

■

Abdul Wadood Ansari
Shadab Manzil, H. No: 43/2, B.L. No:6
Kankinara- 743126 (West Bengal)
Mob.: 9674895325

مختار ٹونکی

طوطے کی بات

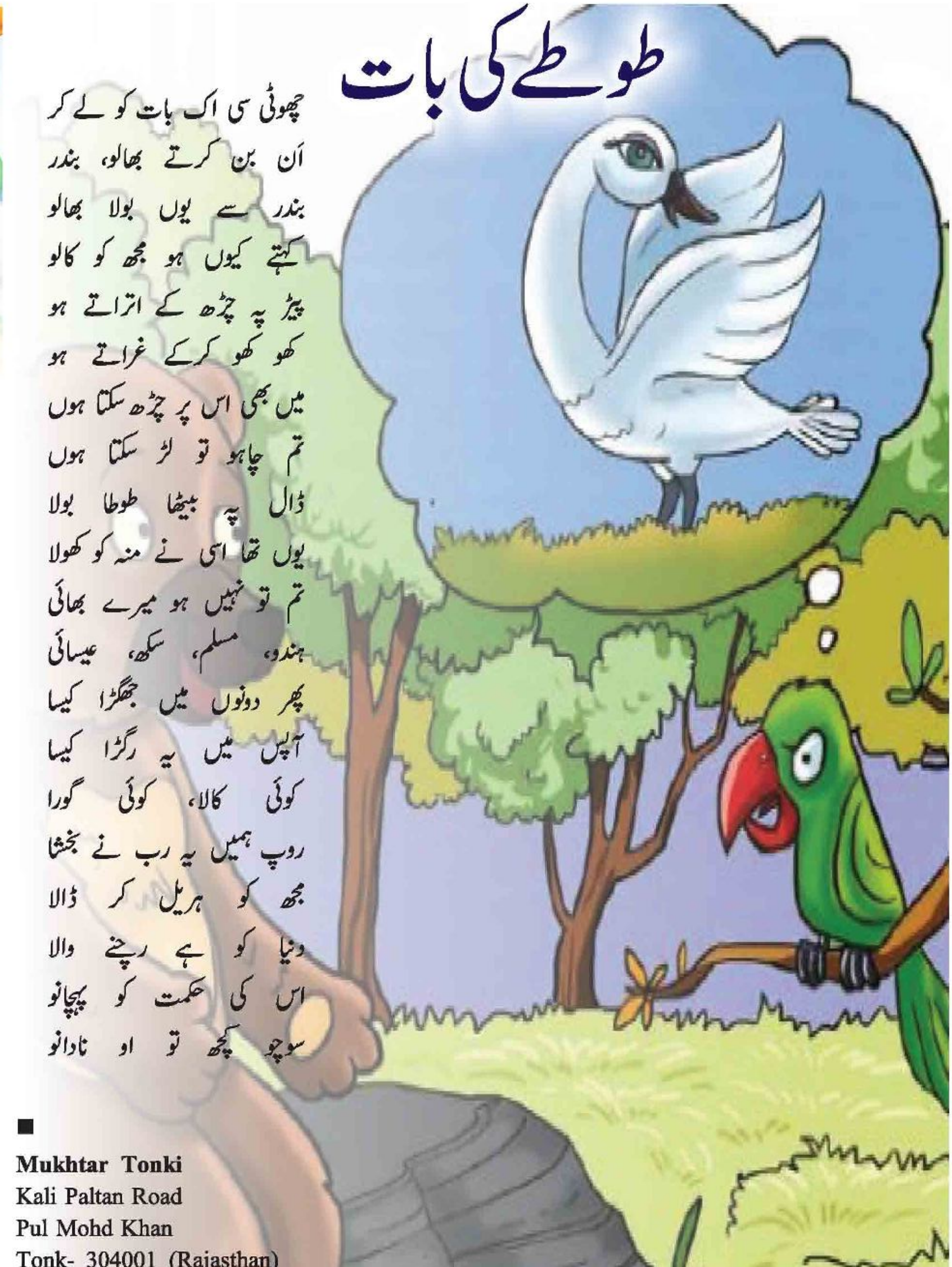

چھوٹی سی اک بات کو لے کر
اَن بن کرتے بھالو، بندر
بندر سے یوں بولا بھالو
کہتے کیوں ہو مجھ کو کالو
پیڑ پہ چڑھ کے اتراتے ہو
کھو کھو کرکے غراتے ہو
میں بھی اس پر چڑھ سکتا ہوں
تم چاہو تو لڑ سکتا ہوں
ڈال پہ بیٹھا طوطا بولا
یوں تھا اسی نے منہ کو کھولا
تم تو نہیں ہو میرے بھائی
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی
پھر دونوں میں جھگڑا کیسا
آپس میں یہ رگڑا کیسا
کوئی کالا، کوئی گورا
روپ ہمیں یہ رب نے بخشا
مجھ کو ہریل کر ڈالا
دنیا کو ہے رچنے والا
اس کی حکمت کو پہچانو
سوچو کچھ تو او نادانو

■

Mukhtar Tonki
Kali Paltan Road
Pul Mohd Khan
Tonk- 304001 (Rajasthan)
Mob.: 9214826684

ضیاء الرحمن جعفری

نظم

تمھیں بدھائی

بولا شاہو، نہیں نہاؤ
اتنی ٹھنڈی چیز نہ کھاؤ

آئس کریم کو کھانا کیسا
فیور سردی لانا کیسا

اتنی ضد بھی ٹھیک نہیں ہے
اپنی مرضی ٹھیک نہیں ہے

فقط دودھ ہی پینا کیا ہے
نہیں مکمل اس میں غذا ہے

تھوڑا چاول روٹی کھالو
فروٹ مٹھائی سبزی کھالو

دیکھو سب کھاتے بریانی
بس تم کرتے آنا کانی

باہر جاکر دوڑ کے لانا
چیزیں سب بازارو کھانا

یہ سب عادت ٹھیک نہیں ہے
ذرا یہ فطرت ٹھیک نہیں ہے

کبھی نہ بنتی اس سے صحت
لگ جاتی ہے بری یہ عادت

پڑھنے میں بھی دل کو چرانا
نہیں وقت سے کھانا کھانا

ہوتی میٹھی نہیں جو بولی
چل جاتی ہے دل پہ گولی

ہوگی تم میں جو اچھائی
دیں گے سارے تمھیں بدھائی

(تعارف فروری 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Dr. Zeaur Rahman Jafri
Post Graduate, Hindi Dept
Mirza Ghalib College
Gaya- 823001 (Bihar)
Mob.: 9934847941

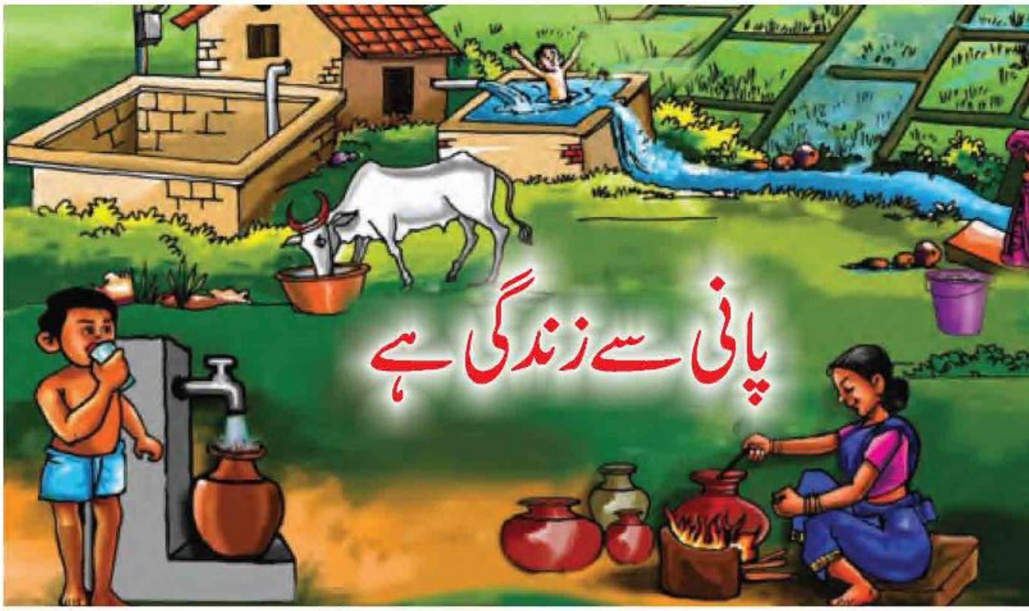

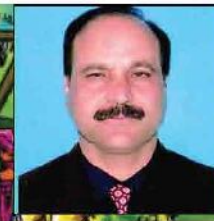

پرویز مانوس

پانی سے زندگی ہے

نظم

ہے زندگی اسی سے ہے یہ زمانہ
جنگل بچاؤ یارو! پانی کو ہے بچانا
دیکھیں گے غور سے تو ہر بوند زندگی ہے
پانی کی قدر کرنا رب کی ہی بندگی ہے
اس کے بنا زمیں سے نکلے نہ اک بھی دانہ
جنگل بچاؤ یارو! پانی کو ہے بچانا
کیسی عطا ہوئی ہے رب سے ہمیں یہ نعمت
کالی گھٹا کی صورت برسے ہے ہم پہ رحمت
کتنا حسین اور ہے انمول یہ خزانہ
جنگل بچاؤ یارو! پانی کو ہے بچانا
دھرتی میں اس کے دم سے اگتی ہیں ساری فصلیں
کھانے کو جن سے آگے بڑھتی ہیں اپنی نسلیں
پیدا اناج ان سے ہوگا تبھی ہے کھانا
جنگلات کو بچا کر پانی کو ہے بچانا
سب سے ہے یہ گزارش نل کو کھلا نہ چھوڑیں
یہ فرض ہے سبھی کا ہرگز نہ منہ کو موڑیں
اس عہد کو ہے آگے مل کر ہمیں نبھانا
جنگل بچاؤ یارو! پانی کو ہے بچانا
جب بھی ہو چھت پہ بارش محفوظ اس کو کر لیں
کھودے ہوئے زمیں کے کھڈے میں اس کو بھر لیں
انسانیت کی خاطر سب یہ قدم اٹھانا
جنگل بچاؤ یارو! پانی کو ہے بچانا
آتا ہے کام اپنے ہر پل یہ زندگی میں
آبِ حیات ہم کو لگتا ہے تشنگی میں
پانی کی قدر کرنا بچوں کو ہے سکھانا
جنگل بچاؤ یارو! پانی کو ہے بچانا
فریاد بارشوں کی دیکھو کریں پرندے
پڑ جائے نہ قحط پھر پیاسے مریں پرندے
مانوس کو خدایا وہ دن نہ تو دکھانا
جنگل بچاؤ یارو! پانی کو ہے بچانا

■

Parvez Manoos
Azad Basti, West Niti Pura
Srinagar- 190015 (J&K)
Mob.: 9419463487

الماس محمود

اب تھم بھی جا

بادل بھائی! ہے ہرجائی
جتنا گرجا! اتنا برسا
کیچڑ پھیلے، کپڑے میلے
گھر میں پھنسے، کیسے ہنسیں
سب گھبرائے، کدھر جائیں
گھر ہے چوتا، بہہ گیا جوتا
بھر گئے نالے، لگ گئے تالے
سورج آؤ، ہم کو بچاؤ
کہتی نانی، رک جا پانی
دل نہ جلایوں، اب تھم بھی جا

■

Almas Mahmood
Aashiyan Buliding
4th Floor, Flat No 4C
284, Belilious Road
Howrah- 711101 (West Bengal)
Mob.: 9007936622

مصباح الدین طارق

ابو ہمارے

بہت خوبصورت ہیں ابو ہمارے
محبت، محبت ہیں ابو ہمارے
کسی بات پر ہم کبھی روٹھ جائیں
کہانی سنا کر ہمیں وہ منائیں
کسی کام سے جب بھی بازار جائیں
ہمارے لیے ٹافیاں ساتھ لائیں
بزرگوں کے ہم کو وہ قصے سنائیں
برا کیا بھلا کیا ہے ہم کو بتائیں
جو امی کے قدموں میں جنت نہاں ہے
تو دروازہ جنت کا بولو کہاں ہے
جو کرتے ہیں ماں باپ کی دل سے خدمت
خدا ان کو دیتا ہے بدلے میں جنت
دعا ہے کہ قائم رہے یوں ہمیشہ
سدا ان کی شفقت کا الفت کا سایہ
ذرا پوچھو ان سے نہیں جن کے ابو
سدا ان کی آنکھوں میں رہتے ہیں آنسو

■

Misbahuddin Tariq
P.O: Hathiyar, Via: Bodh Gaya
Distt. Gaya - 824231 (Bihar)
Mob.: 9801996877

فردوس بانو فلاحی

بلبل

آئی رت مستانی ہے — موسم دھانی دھانی ہے
جھوم کے آئی برکھا رانی — ہوگئی دھرتی پانی پانی
پھول کھلے ہریالی آئی — ہوا چلی متوالی آئی
پنچھی بادل میں لہرائیں — چہک چہک کے شور مچائیں
بلبل کی اک ٹولی آئی — بولتی میٹھی بولی آئی
تنکوں کی اک جالی ہے — ڈال پہ جیسے پیالی ہے
بلبل اس میں انڈے دیتی — پیار سے اس کو دن بھر سیتی
چند دنوں میں نکلے بچے — گوشت کے جیسے ٹکڑے کچے
دن بھر چیں چیں کرتے ہیں — ممی سے کچھ کہتے ہیں
بھوک لگی ہے کھانا دو — لاؤ ممی دانہ دو
پیلے پیلے بال آئے — پنکھے کالے لال آئے
ڈالی پر اچھلیں کودیں — نیند آئے آنکھیں موندیں
جب جب ماں دانہ لائے — کھولے منھ کو پر پھیلائے
ماں کے اوپر ٹوٹ پڑیں — کبھی نہیں آپس میں لڑیں
پورا پیڑ ہے ان کا گھر — نہیں ہے کوئی ان کو ڈر

اک دن ماں کے ساتھ اڑے
اب تک واپس نہیں ہوئے

■

Firdaus Bano Falahi
Gulmarg Apst.
Abul Fazal Enclave
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi-110025

اسد رضا

احساس

''یہ امّی کی بچّی! مجھے ہر وقت ٹوکتی اور ڈانٹتی رہتی ہے۔ موبائل تو میرے ہاتھ میں دیکھ ہی نہیں سکتی، فوراً چھین لیتی ہے۔ ہر وقت بس پڑھنے کی تاکید کرتی رہتی ہے۔ ارے بھئی! پڑھانے اور نصیحتیں دینے کے لیے تو ہمارے اسکول کے ٹیچر کیا کم ہیں جو گھر میں ایک گھنٹہ بھی موبائل پر تفریح کرنے نہیں دیتی۔ اسکول میں بھی پڑھو اور گھر پر بھی پڑھو۔'' آٹھویں کلاس کے 13 سالہ طالب علم نجم عثمانی کو اپنی امّی پر بہت غصہ آرہا تھا کیونکہ ابھی ابھی دو منٹ پہلے ہی امّی نے نجم کے ہاتھ سے موبائل چھین لیا تھا اور ہوم ورک کرنے کی تاکید کی تھی۔

'یہ امڑی'' دراصل شدید غصے میں نجم اپنی امّی کو امڑی بھی کہہ دیتا تھا۔ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ ''یہ امڑی نجمہ آپا کی تو تعریف کرتی ہیں کہ وہ اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن حاصل کرتی ہیں اور دسویں کے امتحان میں ان کے 95 فیصد نمبر آئے تھے۔ مگر میری برائی کرتی ہیں کہ میں پڑھائی پر کم اور کھیل کود و موبائل پر زیادہ توجہ دیتا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ششماہی امتحان میں سائنس اور حساب میں مجھے کم نمبر ملے تھے لیکن میں کیا کروں جب سائنس ٹیچر کی پڑھائی میری سمجھ میں کم آتی ہے اور حساب کے ماسٹر صاحب تو ہوائی جہاز کی طرح اڑتے ہوئے تیزی سے سوال بتاتے ہیں۔ اب آپ ہی انصاف سے بتائیے کہ اگر نمبر اچھے نہیں آئیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔''

دراصل نجمہ اسکول کے بعد ٹائم ٹیبل بنا کر ہر مضمون ایک گھنٹہ پڑھتی تھیں البتہ درمیان میں وہ اپنی سہیلی نسیم کے ساتھ کھیلتی بھی تھیں اور باتیں بھی کرتی تھیں لیکن بات چیت میں فزکس کیمسٹری اور بایولوجی جیسے اپنے مضامین کے بارے میں بھی ڈسکس کرتی رہتی تھیں اور اپنی مشکلات حل کرتی رہتی تھیں۔ اگرچہ نجمہ بھی موبائل استعمال کرتی ہیں لیکن وہ موبائل پر الٹی سیدھی فلمیں، سیریل اور کارٹون نہیں دیکھتیں بلکہ اپنے مضامین سے متعلق کوچنگ کلاسز دیکھتی ہیں اور اپنے مسائل ومشکلات کو حل کرتی ہیں۔ لہٰذا ان کو امّی موبائل دیکھنے سے نہ روکتی ہیں اور نہ ہی ٹوکتی ہیں۔ ان کے برخلاف نجم موبائل پر صرف کارٹون، سیریل اور بیہودہ فلمیں دیکھتا ہے۔ اس لیے پڑھائی میں پچھڑا ہوا ہے اور امی پاپا سے اس سلسلے میں ڈانٹ کھاتا رہتا ہے۔

آج تو امی نے حد ہی کردی۔ انھوں نے نجم سے موبائل چھین کر اُسے سیلف میں رکھ کر لاک کردیا۔ لہٰذا نجم کا موڈ

کہانی

خراب تھا۔ اپنا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے وہ گھر کے سامنے واقع پارک میں گھومنے چلا گیا جہاں ان کی کالونی اور اسکول کے تین لڑکے جو پڑھنے لکھنے میں نجم کی طرح پھسڈی ہیں، بیٹھے ہوئے گپیں ہانک رہے تھے اور بیڑیاں بھی پھونک رہے تھے۔نجم بھی ان کے پاس بیٹھ گیا تو ایک لڑکے نے پوچھا ''نجم آج بہت تناؤ میں نظر آرہے ہو۔خیریت تو ہے۔''

''ہاں آج امّی نے میرا موڈ خراب کردیا۔ میں موبائل پر ایک فلم دیکھ رہا تھا لیکن انھوں نے مجھے ڈانٹنے اور ٹوکنے کے بعد میرے ہاتھ سے موبائل چھین لیا اور اسے اپنی سیلف میں رکھ کر اس کو لاک کر دیا اور چابی اپنے پاس رکھ لی۔''

''ارے بھئی۔ سبھی ماں باپ ایسا ہی کرتے ہیں۔ میری ممّی نے بھی دو گھنٹے پہلے ایسا ہی کیا تھا اور میں ٹینشن میں آکر یہاں آگیا۔'' دوسرے لڑکے اسلم نے کہا تو پہلا لڑکا کہنے لگا۔''ارے یار! ہمارے ممّی پاپا بس اپنی خواہش ہم پر لادتے ہیں۔ ہمارے من کی بات سنتے ہی نہیں۔ اسی لیے میں بھی اپنا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے پارک میں آجاتا ہوں۔''

''یار اسلم! میرے تو سر میں درد ہوگیا۔'' نجم نے سر پکڑتے ہوئے کہا تو اسلم نے ایک بیڑی اور ماچس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''لو، ایک بیڑی کا کش سر درد اور تناؤ ختم کر دے گا۔''

''نہیں نہیں، میں بیڑی نہیں پیوں گا۔ میرے پاپا کو پتہ چل گیا تو وہ مجھے بری طرح ماریں گے۔'' نجم نے ہاتھ کے اشارے سے منع کیا تو پہلا لڑکا بولا۔''نجم! بیڑی کا دھواں ہر درد کی دوا ہے۔ پی کر تو دیکھو ایک بیڑی'' یہ سن کر نجم نے بیڑی سلگائی اور ایک ہی کش لیا تھا کہ اس کا سر گھوم گیا۔ اسی دوران پارک کے سامنے والے گیٹ سے اس کے پاپا بائک سے کالونی میں داخل ہوئے۔ وہ دفتر سے آرہے تھے اور انھوں نے نجم کو بیڑی پیتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اپنے پاپا کو دیکھ کر نجم سٹپٹا گیا اور بیڑی، ماچس کو پھینک کر دوڑتے ہوئے اپنے گھر جا کر واش بیسن پر جا کر کلّی کی اور سیدھے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

ایک منٹ بعد پاپا گرجتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ ان کی آنکھیں غصے سے سرخ تھیں۔ انھوں نے گھر میں آکر فوراً امّی سے سوال کیا۔ یہ نجم کا بچہ کہاں ہے۔ اب بدمعاش لڑکوں کے ساتھ پارک میں بیڑی پینے لگا ہے۔ وہ یہ کہہ کر سیدھے نجم کے کمرے میں گھس گئے جہاں ان کا بیٹا ڈرا سہا ہوا ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پاپا کے غصے کو دیکھ کر نجم ہاتھ جوڑ کر چوروں کی طرح کھڑا ہوگیا۔ اس بیچ ان کی امّی بھی کمرے میں داخل ہوئیں۔ پاپا نے جیسے ہی نجم کو پیٹنے کے لیے ہاتھ اٹھایا فوراً امّی ان دونوں کے درمیان آئیں۔

آج نجم کو بخش دیجیے۔ اب آئندہ یہ بدمعاش بچوں کے پاس نہیں جائے گا۔ اور نہ ہی بیڑی پیے گا۔ یہ کہہ کر امّی نے نجم کو اپنے گلے سے لگالیا۔ ''بیٹا! آج تو میں نے تمھیں پاپا کی مار سے بچالیا، لیکن اگر تم نے اپنی عادت نہیں چھوڑی تو پاپا کے ساتھ ساتھ میں بھی تمہیں پیٹوں گی۔''

''پاپا امّی مجھے معاف کر دو میں وعدہ کرتا ہوں۔ اب ان گندے لڑکوں کے ساتھ نہیں بیٹھوں گا اور نہ ہی بیڑی کو ہاتھ لگاؤں گا۔'' نجم نے روتے اور کانپتے ہوئے کہا اور اپنے سینے سے لگائے ہوئے امّی کمرے سے باہر چلی گئیں۔ پاپا کا غصہ بھی ٹھنڈا ہوگیا اور آج نجم کو پہلی بار احساس ہوا کہ امّی کتنی اچھی ہیں۔

(تعارف جنوری 2022 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Asad Raza
97-F, Sector-7, Jasola Vihar
New Delhi- 110025
Mob.: 9971465648

شہاب افسر خان

برسات کی ایک رات

حنا کو کہانیاں سننے کا بہت شوق تھا! خاص کر ڈراونی کہانیاں اسے بہت پسند تھیں! وہ دادی امی کے پاس ہی سوتی تھی اور ان سے روز ایک کہانی سنتی تھی۔ دادی امی کہانیوں میں ڈراونا پن لانے کے لیے کہانیوں کو موڑ کر ان میں ٹویسٹ لے آتی تھیں اور حنا خوش ہوجاتی تھی۔ وہ روز ایک کہانی سنتی تھی اور دادی امی کی کہانیوں کا پٹارہ اب خالی ہو رہا تھا۔ وہ ان سے کہتی ''دادی امی یہ کہانی تو آپ سنا چکی ہیں۔ کوئی نئی کہانی سنائیے'' دادی امی اپنے دماغ پر زور ڈالتی اور کہتی ''اچھا چلو آج پرنس کی کہانی سناتی ہوں جو شکار کو جاتے ہوئے راستے میں پھنس گیا تھا اور پریوں کی شہزادی نے اسے آ کر بچایا تھا'' حنا تیار ہوگئی لیکن اس کہانی میں اسے مزہ نہیں آ رہا تھا کیونکہ اس میں کوئی ڈراونا موڑ نہیں آ رہا تھا۔ اس لیے حنا کہانی سنتے سنتے کب سوگئی اسے پتہ ہی نہیں چلا اور دادی امی نے اسے آہستہ سے اپنے بستر پر لٹا دیا۔

دوسرے دن حنا نے پھر دادی سے کہانی سنانے کی ضد کی۔ دادی امی اس کا دل نہیں توڑنا چاہ رہی تھی اس لیے انھوں نے کہا ''بیٹی آج کہانی آپ کے دادو سے سنو! وہ شکار کو جایا کرتے تھے اور ان کے پاس شکاریوں، شیروں، ہاتھیوں، چیتوں، بندروں، گھوڑوں، ہرنوں جنگلی سوروں، جیرافوں، زیبروں اور اونٹوں کی کہانیاں ہیں جو خطرناک بھی ہیں اور ڈراونی بھی۔ جاؤ آج اپنے دادو کو پکڑو اور ان سے کہانی سنو!''

''دادی امی آپ سچ بول رہی ہیں؟ دادو کو یہ سب کہانیاں آتی ہیں؟ کیا انھوں نے آپ کو یہ سب کہانیاں سنائی ہیں؟'' دادی نے اپنا پلو جھاڑتے ہوئے کہا ''ارے میری بنو رانی حنا۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟ پوچھو اپنے ابو سے۔ آپ کے ابو دادو ہی سے کہانیاں سن سن کر اتنے مضبوط اور طاقتور بنے ہیں۔'' ابو اس وقت گھر پر نہیں تھے اس لیے حنا دادی کی اس بات کی تصدیق نہیں کر پائی اور یقین کر لیا کہ دادو بہت ہی

مزیدار کہانیاں سناتے ہیں۔ وہ دادو کے پاس دوڑتی گئی اور دادو سے کہانی کی فرمائش کی! ''دادو! کیا آپ مجھے آج کوئی اچھی سی کہانی سنائیں گے۔ دادی امی کہہ رہی ہیں کہ آپ کو بہت سارے جنگلی جانوروں کی خوف ناک اور ڈراونی کہانیاں آتی ہیں! پلیز مجھے آج ایک اچھی سی پھڑک دار کہانی سنائیے۔''

''گڑیا رانی آپ کو یہ کس نے کہا کہ میں کہانی سناتا ہوں؟'' دادو نے حنا سے دریافت کیا

''دادی امی نے!'' دادو نے دادی کی طرف دیکھا اور دادی نے اپنی دائیں آنکھ کا اشارہ کیا۔ دادو سمجھ گئے کہ آج کہانی سنانے کی ان کی باری ہے اور حنا انھیں چھوڑنے والی نہیں ہے۔ وہ دادو کے بستر پر چڑھ گئی اور ان کے سیدھے ہاتھ پر اپنا سر رکھ کر کہانی سننے کے لیے تیار ہوگئی ''ہاں دادو'' دادو شروع ہوئے۔

''برسات کا موسم تھا اور میں شکار کے لیے تیار ہو رہا تھا۔ دن میں آسمان صاف تھا اور بارش کے کوئی آثار نہیں تھے۔ میں نے اپنا جال اٹھایا اور جنگل کا رخ کیا۔''

''دادو آپ اکیلے ہی شکار کے لیے نکل گئے؟ کوئی آپ کے ساتھ شکار کو نہیں گیا؟'' دادو کی ایک خاص عادت تھی۔ جب وہ شکار کے لیے جاتے تو انھیں یہ پسند نہیں تھا کہ کوئی انھیں ٹوکے! وہ یہ مانتے تھے کہ شکار کو جاتے ہوئے کسی نے انھیں ٹوکا تو انھیں اس روز خالی ہاتھ واپس آنا پڑتا تھا۔ اس لیے دادو کسی کے ٹوکنے سے چڑ جاتے تھے اور 'تھوتھ تیری کی' کہہ کر یا تو شکار کو نہیں جاتے تھے یا کچھ وقفہ ٹھہر کر پھر شکار کو جاتے تھے۔

''گڑیا رانی اس روز کسی نے مجھے ٹوک دیا تھا اس لیے میں اپنے پوتوں اور نواسوں کو ساتھ نہیں لے گیا تھا اور انھیں ترک کر دیا تھا'' دادو جب بھی غصے میں آتے تو ان لوگوں کو 'ترک' کر دیتے تھے جو انھیں شکار کو جاتے ہوئے ٹوک دیتے تھے۔

''دادو! پھر کیا ہوا؟'' دادو نے اپنی کہانی شروع کی

''اس روز میں تنہا ہی اپنے جالوں کی تھیلی لیے ہوئے نکلا۔ تیتر اور بٹیر کے لیے جھاڑیوں میں دانے ڈالے اور جال بچھا دیا! جال کی دوسری جانب سے انھیں جال کی طرف دوڑانے کے لیے 'ہوش اور ہر' کرتے ہوئے آگے بڑھا۔ چند تیتر اور بٹیر جال سے کچھ دیر پہلے ہی اڑ گئے کیونکہ وہاں ایک چرواہا اپنے جانور چرا رہا تھا۔ اور جانوروں کی حرکات وسکنات سے بٹیر اور تیتر بجائے جال میں جانے کے پہلے ہی اڑ گئے۔ اس کے بعد کئی جگہ جال ڈالے اور جنگل میں دور تک نکل گیا لیکن وہ دن ہی خراب تھا اس لیے شکار ہاتھ نہیں آیا۔

شام ہونے کو تھی اور آسمان میں گھنے بادل چھا گئے اور اندھیرا ہونے لگا۔ بجلیاں کڑکنے لگی اور زور دار بارش شروع ہوگئی۔ میں ایک برگد کے پیڑ کے نیچے کھڑا ہوگیا۔ لیکن موسلا دھار بارش سے میں بھیگ کر تر بتر ہوگیا تھا۔ ڈر رہا تھا کہ کوئی جنگلی جانور مجھ پر حملہ نہ کر دے لیکن بارش اتنی تیز تھی کہ جنگلی جانور خود کہیں دبکے ہوئے تھے۔ اس لیے ان سے حملے کا ڈر کم ہوگیا تھا۔ بجلیاں کڑک رہی تھیں اور بارش تھی کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔''

''دادو آپ کو بڑے زوروں سے بھوک بھی لگی ہوگی؟'' حنا نے دادو سے پوچھا۔

''ہاں بیٹی بھوک تو لگی تھی لیکن اس اندھیری رات میں بارش اور اس پر جنگلی جانوروں کا ڈر۔ یوں سمجھ لو کہ بھوک رفو چکر ہوگئی تھی۔ تین ساڑھے تین گھنٹوں کی مسلسل بارش اب کچھ کم ہوگئی تھی۔ سوچا واپس چلوں۔ اپنے جالوں کا تھیلا

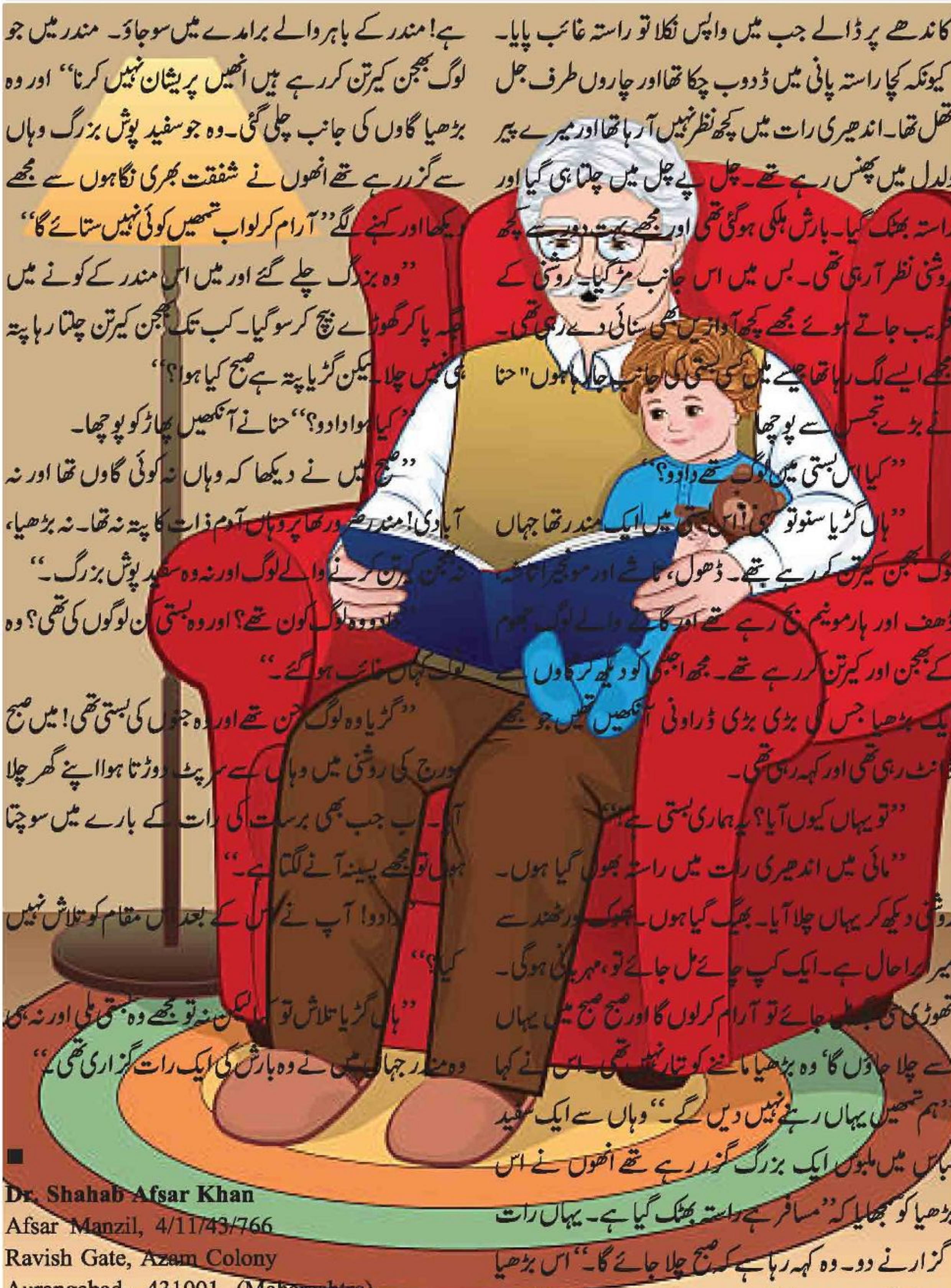

کاندھے پر ڈالے جب میں واپس نکلا تو راستہ غائب پایا۔ کیونکہ کچا راستہ پانی میں ڈوب چکا تھا اور چاروں طرف جل تھل تھا۔ اندھیری رات میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا اور میرے پیر دلدل میں پھنس رہے تھے۔ چل پے چل میں چلتا ہی گیا اور راستہ بھٹک گیا۔ بارش ہلکی ہوگئی تھی اور مجھے بہت دور سے کچھ روشنی نظر آرہی تھی۔ بس میں اس جانب مڑ گیا۔ روشنی کے قریب جاتے ہوئے مجھے کچھ آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ مجھے ایسے لگ رہا تھا جیسے میں کسی بستی کی جانب جا رہا ہوں" حنا نے بڑے تجسس سے پوچھا۔

''کیا اس بستی میں لوگ تھے دادو؟''

''ہاں گڑیا سنو تو سہی! اس بستی میں ایک مندر تھا جہاں لوگ بھجن کیرتن کر رہے تھے۔ ڈھول، تاشے اور مونجیرا تانسہ ڈھف اور ہارمونیم بج رہے تھے اور گانے والے لوگ جھوم کے بھجن اور کیرتن کر رہے تھے۔ مجھ اجنبی کو دیکھ کر گاؤں سے ایک بڑھیا جس کی بڑی بڑی ڈراونی آنکھیں تھیں جو مجھے ڈانٹ رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔

''تو یہاں کیوں آیا؟ یہ ہماری بستی ہے۔''

''مائی میں اندھیری رات میں راستہ بھول گیا ہوں۔ روشنی دیکھ کر یہاں چلا آیا۔ بھیگ گیا ہوں۔ بھوک اور ٹھنڈ سے میرا برا حال ہے۔ ایک کپ چائے مل جائے تو، مہربانی ہوگی۔ تھوڑی سی جگہ مل جائے تو آرام کرلوں گا اور صبح صبح میں یہاں سے چلا جاؤں گا' وہ بڑھیا ماننے کو تیار نہیں تھی۔ اس نے کہا ''ہم تمھیں یہاں رہنے نہیں دیں گے۔'' وہاں سے ایک سفید لباس میں ملبوس ایک بزرگ گزر رہے تھے انھوں نے اس بڑھیا کو سمجھایا کہ ''مسافر ہے راستہ بھٹک گیا ہے۔ یہاں رات گزارنے دو۔ وہ کہہ رہا ہے کہ صبح چلا جائے گا۔'' اس بڑھیا نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا ''ٹھیک ہے! مندر کے باہر والے برامدے میں سو جاؤ۔ مندر میں جو لوگ بھجن کیرتن کر رہے ہیں انھیں پریشان نہیں کرنا'' اور وہ بڑھیا گاؤں کی جانب چلی گئی۔ وہ جو سفید پوش بزرگ وہاں سے گزر رہے تھے انھوں نے شفقت بھری نگاہوں سے مجھے دیکھا اور کہنے لگے ''آرام کرلو اب تمھیں کوئی نہیں ستائے گا''

''وہ بزرگ چلے گئے اور میں اس مندر کے کونے میں جگہ پاکر گھوڑے بیچ کر سو گیا۔ کب تک بھجن کیرتن چلتا رہا پتہ ہی نہیں چلا۔ لیکن گڑیا پتہ ہے صبح کیا ہوا؟''

''کیا ہوا دادو؟'' حنا نے آنکھیں پھاڑ کو پوچھا۔

''صبح میں نے دیکھا کہ وہاں نہ کوئی گاؤں تھا اور نہ آبادی! مندر ضرور تھا پر وہاں آدم ذات کا پتہ نہ تھا۔ نہ بڑھیا، نہ بھجن کیرتن کرنے والے لوگ اور نہ وہ سفید پوش بزرگ۔''

''دادو وہ لوگ کون تھے؟ اور وہ بستی کن لوگوں کی تھی؟ وہ لوگ کہاں غائب ہوگئے۔''

''گڑیا وہ لوگ جن تھے اور وہ جنوں کی بستی تھی! میں صبح سورج کی روشنی میں وہاں سے سرپٹ دوڑتا ہوا اپنے گھر چلا آیا۔ اب جب بھی برسات کی رات کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے پسینہ آنے لگتا ہے۔''

''دادو! آپ نے اس کے بعد اس مقام کو تلاش نہیں کیا؟''

''ہاں گڑیا تلاش تو کیا لیکن نہ تو مجھے وہ بستی ملی اور نہ ہی وہ مندر جہاں میں نے وہ بارش کی ایک رات گزاری تھی۔''

■

Dr. Shahab Afsar Khan
Afsar Manzil, 4/11/43/766
Ravish Gate, Azam Colony
Aurangabad- 431001 (Maharashtra)
Mob.: 7387031778

انمول تحفہ

افتخار انیس حمیدی

کورونا کووڈ19 گائڈ لائن اور لاک ڈاؤن کے سبب پچھلے دو سال سے اسکول بند تھے اور پڑھائی آن لائن چل رہی تھی۔ اس سال یہ پابندیاں ہٹا دی گئیں اور بچوں کے اسکول پہلی اپریل سے کھل چکے تھے۔ والدین بچوں کے داخلہ دلانے کو ان کے لیے اسکولوں کے چکر لگا رہے تھے۔ داخلے کے بعد ان کے کورس، کتابوں، کاپیوں، اسکول یونی فارم اور اسکول بیگ نئے جوتے موزے کے انتظام میں مصروف ہو گئے تھے۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا والدین پر بچوں کی پڑھائی اور ان کے سامان خریدنے کا بوجھ بڑھتا جا رہا تھا۔ کسی کے بچے نئے کورس مانگ رہے تھے تو کسی کے بچے اسکول ڈریس۔ کسی کے ذریعے نئے جوتے یا نئے بیگ کی فرمائش ہو رہی تھی۔ والدین اپنی پوری توجہ بچوں کی فرمائش پر ہی لگائے ہوئے تھے۔ وہ بچوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔

ہماری عائشہ اپنے والدن کے ساتھ دھرم پور کے محلّہ بڑے گھیر میں رہتی ہے۔ عائشہ کے دونوں بھائی اس کو پیار سے چوہیا کہتے تھے۔

وہ تینوں پبلک مونٹیسری اسکول میں پڑھتے ہیں۔ عائشہ چوتھی کلاس میں پڑھائی کر رہی ہے۔ دوسرے بچوں کی طرح وہ بھی اپنی ممی سعدیہ جہاں سے نئے بستے کی ضد کر رہی تھی۔

عائشہ' ممی! مجھے تو اس سال نیا بیگ چاہیے دو سال پہلے جو بیگ خریدا تھا بہت خراب ہو گیا۔''

اس کی ممی آج کل، آج کل کر رہی تھیں۔

عائشہ نے اپنی ممی سے کہا'' مجھے تو نئے کورس کے ساتھ نیا بستہ ضرور چاہیے۔ وہ بھی عمدہ قسم کا۔ میری سہیلی مہک نے پرکاش بک ڈپو سے نیا بیگ خریدا ہے، وہی مجھے بھی چاہیے۔''

ممی نے جواب دیا'' ہاں بھئی! بیگم صاحبہ جیسا آپ کا حکم؛ جہاں سے آپ کہیں گی آپ کو دلا دیا جائے گا۔''

عائشہ کے والد ابن شجر دہلی میں کسی کمپنی میں ملازم تھے۔ ان کی تنخواہ بہت ہی مختصر تھی پھر بھی اس کے دو بھائیوں، شان اور چاند کے ساتھ اس کی تعلیم و تربیت اچھی طرح کی جا رہی تھی۔ پڑھائی لکھائی میں کوئی سمجھوتہ نہیں کیا جا رہا تھا اور نہ خرچ میں کوئی کمی کی جا رہی تھی۔

آج کل انگریزی میڈیم اسکولوں کے اپنے الگ نخرے، ان کا کورس یا کتابیں صرف ان کے ایک خاص بک سیلر کے یہاں ہی یا اسکول میں ہی ملیں گی۔ پبلک مانٹیسری اسکول کی کتابیں پرکاش بک ڈپو کے یہاں ہی مل رہی تھیں۔

ہر سال کتابوں کی قیمت میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور اوپر سے اسکول کا کمیشن۔ اس لیے وہ کتابوں کے ساتھ ساتھ اسٹیشنری اسکول ڈائری؛ کاپیاں وہ بھی اسکول کے نام والی؛ پین، پنسل ربر کٹر جامیٹری کا سامان آرٹ ڈرائنگ پینٹنگ کے متعلق سامان اور دوسری اسٹیشنری؛ کتابوں کے لیے چٹ، اور اسکول کے نام والے کور؛ پانی کی بوتل جوتے موزے ٹائی بیلٹ اور اسکولی یونی فارم شرٹ نیکر، پینٹ یا اسکرٹ، سپورٹ یا پٹی شوز، سوئٹر کوٹ بلیزر اسکارف اور آئی کارڈ۔ اسکول کا حکم

ہے کہ سب ہی چیزیں لینا بے حد ضروری ہیں۔ اس کے بغیر اسکول میں داخلہ منع ہے۔

بچے کے ماں باپ اگر دوکان پر پہنچ جائیں تو بقول ان کے ''دوکاندار تو کھال ہی کھینچ لے گا۔''

عائشہ کے پاپا کو ابھی اس ماہ کی تنخواہ نہیں ملی تھی اس لیے اس کی ممی نے تینوں بچوں کو کورس تو دلا دیا تھا مگر عائشہ کے بستے کو ٹال رہی تھیں۔ وہ راضی ہوتی نہ تھی۔ اس کو تو ہر حال میں اور کسی بھی قیمت میں نیا بستہ لینا ہی ہے۔

ہر گھر کا ایک ماحول ہوتا ہے۔ یہ ماحول ایک سانچا ہوتا ہے اور بچے اس گھر کے ماحول کا آئینہ ہوتے ہیں۔

بچے گھر کے ماحول سے ہر بات سیکھتے ہیں۔

گفتگو کے لیے منہ انسان اپنا کھولتا ہے۔ مگر اس کی گفتگو کرنے کے طریقے سے آسانی سے اس کی تربیت کا اندازہ لگ جاتا ہے۔

عائشہ کی والدہ سعدیہ بہت عبادت گزار اور بڑی ہی نیک سلیقہ شعار باہمت اور ایمان دار خاتون تھیں۔ وہ ہر مہینے اس کے پاپا کی تنخواہ میں سے کچھ پیسے کی بچت کر کے جمع کر لیتی۔ جو وقت ضرورت کام آسکے۔ ان کے بڑے بچے بھی گھر کے حالات جانتے تھے ان کو بتایا گیا تھا کہ جتنی چادر ہو اتنا ہی پیر پھیلانا چاہیے۔ وہ فضول خرچ نہیں کرتے، مگر عائشہ گھر میں سب سے چھوٹی؛ پاپا کی لاڈلی اور اکلوتی بیٹی تھی۔ اس لیے اس کے ناز اور نخرے ذرا زیادہ ہی تھے۔ وہ ابھی نادان اور ناسمجھ بھی تھی اس لیے ضد کر بیٹھتی، اور اس کی ضد پوری بھی ہو جاتی۔

اتوار کے دن اس کے پاپا ابن شجر نے دہلی سے کسی طرح سے کچھ روپیہ گھر بھجوائے تھے۔ پیسہ ملتے ہی عائشہ کی ممی سعدیہ نے اس کا اسکول بیگ لینے کا ارادہ کیا اور عائشہ سے کہا چلو تم کو آج بیگ دلا دیا جائے۔''

وہ اس کو لے کر شہر کے مشہور گول بازار میں رکشے سے پرکاش بک ڈپو پر جا پہنچیں۔

دوکان پر کتابیں کاپیاں خریدنے والے بچے اپنے ممی پاپا کے ساتھ پہلے سے لائن لگائے کھڑے تھے۔ بھیڑ کی وجہ سے دوکان پر پیر رکھنے تک کی جگہ نہیں تھی۔ باہر سڑک تک لوگ جمع تھے ایک کے اوپر ایک گرے جا رہے تھے۔

ڈاکٹروں کی طرح ہر خریدار کا نمبر لگایا جا رہا تھا۔ لوگ اپنے نمبر آنے تک ایک پرچی پر کون سی چیز اور کتنی خریدنی ہے لکھ کر دوکان کے ایک نوکر کو دے دیتے تھے اور اپنا نمبر آنے کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنی دیر تک رکنے کی وجہ سے بچے آئس کریم، چپس، کرکرے، گنے کا رس، کولڈ ڈرنک کی مانگ کر رہے تھے۔ ماں باپ ان کی خواہش پوری بھی کر رہے تھے۔ بھیڑ کی وجہ سے دوکان میں شور بھی خوب ہو رہا تھا۔ کتاب کاپیوں میں اتنی دیر نہیں لگ رہی تھی کیونکہ ہر کلاس کا کورس پہلے سے باندھ کر کے بنڈل بنے رکھے تھے۔ مگر دیر لگ رہی تھی تو جوتے یا اسکول بیگ میں۔ بچوں کو جوتوں کی فٹنگ اور اسکول بیگ جلدی سے پسند نہیں آ رہے تھے۔ ہر سال بستوں کے نئے نئے رنگ سائز اور ڈیزائن آتے ہیں۔ اس وجہ سے ایک بچہ کم سے کم دس تھیلے دیکھ کر پسند کر کے ایک خرید رہا تھا۔ اس لیے وقت لگ رہا تھا۔

دوکان پر مالک پرکاش جی کے ساتھ ان کے دو بیٹے سورج اور چندن اور تین نوکر لڑکے کھیتان؛ وکاس اور کلیم ان کی مدد کر رہے تھے۔ یہ چھ لوگ بھی بھیڑ کو قابو نہیں کر پا رہے تھے۔

عائشہ کی ممی سعدیہ جہاں نے بھی ایک پرچی پر دو سو روپیہ تک کا لیدر کا بیگ لکھ کر کلیم کو دے دیا اور اپنی باری آنے کا انتظار کرنے لگیں۔ بھیڑ کی وجہ سے سب کو جلدی ہو رہی تھی۔ عائشہ بھی بے چین اور بور ہو رہی تھی مگر اس سے پہلے تو کئی

لوگوں کا نمبر تھا۔ پھر بھی عائشہ چاہ رہی تھی اس کو جلدی سے نیا بیگ ملے اور گھر جا کر اپنے بھائیوں کو دکھا کر کہے ''دیکھو! میرا نیا بیگ۔ آپ کو نیا بیگ نہیں ملا۔''

عائشہ کی ممی سعدیہ کا نمبر آ گیا۔ ان کے ساتھ دوکان کے اندر عائشہ بھی آ گئی۔ وکاس نے ان کے سامنے پانچ چھ بستے ڈال دیے۔ عائشہ نے ان میں سے ایک اٹھا لیا۔ سعدیہ نے کہا ''بھیا! یہ کتنے کا ہے؟'' پرکاش ''ساڑھے تین سو کا'' یہ لو تین سو روپیہ۔ دوکاندار نے پیسے گنے اور کہا ''اچھا آپ کو ناراض نہیں کروں گا لیجیے یہ بیگ سنبھالیے۔''

عائشہ نے جلدی سے بستہ پکڑا اور وہ دونوں رکشہ کر کے گھر پہنچیں۔ گھر جاتے ہی عائشہ نے اپنے بھائیوں کو دور سے بیگ دکھایا اور اس نے بیگ چیک کیا اور سوچنے لگی ادھر کتابیں رکھوں گی اس میں کاپیاں اور یہاں جومیٹری بکس اور ٹفن باہر کی جیب میں پانی کی بوتل۔'' بیگ کافی موٹا تھا۔ اس نے سمجھا کہ دوکاندار ردی کاغذ بیگ کے اندر رکھ دیتے ہیں جس سے بیگ کی شیپ نہ بگڑے لیکن بیگ کھولتے ہی وہ ڈر کر چونک گئی۔ یہ کیا؟ اس نے ممی سے کہا ''ممی اس بیگ میں تو بہت سے نوٹ ہیں'' اس کی ممی نے بیگ میں نوٹ دیکھے۔ باہر نکال کر گنے؛ دس ہزار روپیہ! اتنی بڑی رقم دیکھ کر۔

وہ بھی تھوڑی دیر کے لیے چکرا گئیں۔

وہ عائشہ سے بولیں ''عائشہ! ان پیسوں کو بیگ میں واپس رکھو اور چلو اس رقم کو پرکاش کو واپس کر آتے ہیں۔ اس بیچارے کی اتنی رقم غائب ہو گی تو وہ بہت پریشان ہو گا اور اس کا نقصان بھی ہو گا۔''

جلدی سے دونوں نے ایک رکشہ کیا اور دونوں واپس پرکاش کی دوکان پر پہنچیں۔ پرکاش نے ان کو دیکھ کر کہا ''کیا ہوا بہن جی؟''

سعدیہ نے جواب دیا ''بھائی صاحب! ہوا یہ کہ آپ نے جو اسکول بیگ دیا تھا اس میں دس ہزار روپے نکلے۔ یہ رہا وہ بیگ اور اس کے اندر آپ کی رقم۔''

پرکاش نے بیگ لیا اور پیسے گنے۔ ''واقعی اس میں دس ہزار روپیے ہیں'' وہ تعجب سے بولا ''بہن جی! اتنی بڑی رقم! اور آپ واپس کرنے چلی آئیں؟''

سعدیہ نے کہا ''یہ پیسے ہمارے لیے بیکار ہیں، اگر واپس نا کرتے تو وہ آپ کی چوری ہوتی''

پرکاش نے کہا ''آپ کا شکریہ! مجھے تو یاد بھی نہیں۔ یہ روپیہ اس بیگ میں کب، کیوں اور کس نے رکھ دیا تھا؟''

سعدیہ نے کہا ''ہماری تو عزت رہ گئی۔ جب آپ کو یاد آتا تو آپ سوچتے وہ کتنا بے ایمان ہو گا جس کو یہ روپیہ ملے۔'' یہ دس ہزار روپیہ دیکھ کر اس کے بڑے بیٹے سورج کو یاد آیا تو اس نے کہا ''ارے! اس بیگ میں میں نے پیسے رکھ دیے تھے۔ جب گھر جاؤں گا تو نکال لوں گا مگر بھول گیا۔''

پرکاش نے روپیے گلے میں رکھ کر عائشہ کو بیگ واپس دے دیا اور کہا ''تم ایک بہت اچھی سچی اور سمجھدار لڑکی ہو اور تمھاری ممی بہت نیک اور ایماندار خاتون ہیں۔ واقعی آپ کے گھر کا ماحول بہت ہی اچھا ہے۔''

پرکاش نے خوش ہو کر عائشہ کو ایک کلر بکس انعام میں دے دیا اور کہا ''یہ ہے تمھارا انمول تحفہ یاد رکھنا۔ اونیسٹی از دی بیسٹ پولیسی۔''

عائشہ نے کلر بکس لے کر جھکتے ہوئے کہا ''تھینک یو انکل۔''

(تعارف جون 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Dr. Iftikhar Anees Hameedi
196, Chilla, Amroha- 244221 (UP)
Mob.:9719308437

کہانی

مون چاند

توصیف بریلوی

میرے فرزند......!

’’محمد احب خان‘‘

امید ہے بہت اچھے ہوں گے۔ خوب مزے کر رہے ہوں گے۔ یہی تو وقت ہے مزہ کرنے کا۔ جب میں آپ کی عمر کا تھا تو میں بھی بہت مزے کرتا تھا۔ سنا ہے آج کل آپ اپنی نانی کے گھر پر بہت شرارتیں کرتے ہیں۔

آپ کی یہ شرارتیں کتنی پیاری لگتی ہوں گی۔ کاش کہ میں آپ کی پیاری پیاری شرارتوں سے لطف اندوز ہو پاتا۔ بہر حال یہ بھی بہت جلد ہوگا۔

آپ سے جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے گاؤں میں کون کون سے جانور دیکھے:

بکری اور اس کے میمنے دیکھے؟ کیا آپ میمنوں کے ساتھ کھیلتے بھی ہیں؟

آپ نے کون کون سی چڑیاں دیکھیں؟ کن کن چڑیوں کو آپ دانہ ڈالتے ہیں؟

فاختہ اور کبوتر تو آپ کو بہت پسند ہیں کیا وہ گاؤں میں ہیں؟ اور آپ ان کے ساتھ کھیلتے ہیں؟

آپ کی اماں بتا رہی تھیں کہ آپ پانی سے بہت کھیلتے ہیں اور جب کوئی آپ کے پاس جاتا ہے تو آپ اس پر بھی پانی کی دھار چھوڑ دیتے ہیں۔ میرے بیٹے پانی بہت قیمتی شے ہے۔ جب آپ سمجھ دار ہوں گے تب تک پانی کی قلت بہت حد تک بڑھ چکی ہوگی۔ آپ کو ابھی سے یہ سمجھنا ہوگا کہ پانی کو بچانا ہے اور صرف ضرورت کے لیے استعمال کرنا ہے۔

آپ کو کہانیاں سننے کا شوق ہے یہ بات جان کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ ان کہانیوں میں بھی آپ کو جانوروں اور پرندوں کی کہانیاں پسند ہیں یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ جب میں آپ کے پاس آؤں گا تو آپ کو اچھی اچھی کہانیاں ضرور سناؤں گا اور انھیں سن کر آپ کو بہت مزہ آئے گا۔ یہ کتے، بلیاں، میمنے، نیولے، بچھڑے، گلہریاں، طوطہ، گوریا، فاختہ، کبوتر، مینا، پھولوں کے پودے اور ان پھولوں پر منڈلانے والی خوبصورت اور منچلی تتلیاں...... وغیرہ سب آپ کے دوست ہی تو ہیں۔ آپ کا ان سب کے بارے میں مزید جاننے کی کوشش کرنا بہت اچھا لگتا ہے اور آپ کے اس تجسس سے مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے۔ اس تجسس کو بنائے رکھیے گا اور اپنے سامنے آنے والے تمام جانداروں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ دریافت کرنے کی کوشش کیجیے گا۔ زندگی معلومات حاصل کرنے اور اسے آگے بڑھانے ہی کا نام ہے۔ یہ جملہ جب آپ بڑے ہو جائیں گے تب بخوبی سمجھیں گے۔

'مون چاند' یہ لفظ تو آپ نے خود ہی تخلیق کیا ہے۔ جب آپ چھوٹے تھے تب آپ چاند کو دیکھ کر ڈرتے تھے لیکن جیسے جیسے بڑے ہوئے ویسے ویسے آپ نے چاند سے بھی دوستی کر لی اور اس کو 'مون چاند' نام دے دیا۔ اب تو آپ اسے چندا ماما بھی کہتے ہیں اور کھانا کھانے کے بعد اپنی پلیٹ بھی آنگن میں جا کر چندا ماما کو دکھاتے ہیں تا کہ چندا ماما کو معلوم ہو سکے کہ آپ نے کھانا کھا لیا ہے۔ یہ ادا بھی کتنی نرالی ہے۔ مون اور چاند دونوں لفظوں کو ملا کر آپ نے نیا لفظ بنایا اور اس کے ساتھ اپنا ماما بھانجے کا رشتہ بھی مستحکم کیا، خوشی کی بات ہے اور عجیب بھی کہ ہمارے ملک میں زیادہ تر بچوں کا ماما چندا ہی ہوتا ہے۔ کیوں ہوتا ہے اور کب سے ہوتا ہے؟ اس کی تاریخ تو نہیں معلوم ہاں اتنا ضرور معلوم ہے کہ یہ سلسلہ صدیوں پرانا ہے۔ اتنا پرانا کہ ہماری نہ جانے کتنی نسلوں نے چاند کو اپنا ماما کہا ہوگا۔ کچھ رشتے ایسے ہی ہوتے ہیں جو صدیوں تک چلتے ہیں اور انسانی رشتوں کو ان سے سبق لینے کی ضرورت ہے۔ اور سب سے زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم انسان مون چاند کے ساتھ ساتھ زمین، آسمان، درختوں، سمندروں، جانوروں، پہاڑوں اور ندیوں سے بھی اپنے تعلقات کو خوش گوار بنا پائیں۔ اس کی ہم سب کو یعنی پوری انسانیت کو بہت ضرورت ہے۔ میرے بیٹے! آپ کی پسندیدہ کہانیوں کے لیے ایک رسالہ بھی بھیج رہا ہوں ان کو ضرور اپنی امّاں سے سنیے گا۔

اپنی شرارتوں، مستیوں، کھیل کود اور کھلونوں کے ساتھ ساتھ اپنی کتابوں کو بھی یاد رکھیے گا۔ انہیں کبھی مت بھولیے گا۔ علم یعنی پڑھائی وہ آلہ ہے جو انسانی زندگی کے اندھیروں کو دور کر کے اسے روشن بناتا ہے۔ علم کی ضرورت ہر قدم پر پڑتی ہے، اسے دل لگا کر حاصل کیجیے گا۔ کچھ ماہ بعد ہی آپ کو نئی دنیا میں قدم رکھنا ہے۔ اسکول کا رخ کرنا ہے۔ اس کے لیے نیک خواہشات اور دعائیں۔ خود کو تیار کیجیے۔ نئی دنیا آپ کی منتظر ہے؛ جہاں سے چاند، تاروں پر جانے کے راستے کھلتے ہیں۔ نئی روشنیوں کے راستے اور نئی دنیا بسانے کے آلات میسر ہوتے ہیں۔ مون چاند پر جانا بھی ممکن ہو سکتا ہے لیکن اس کے لیے مون چاند کی کہانیاں سننے کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ سے علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ کتابوں سے بھی دوستی کر لوگے اور ان کو مزے مزے میں کھیل کھیل میں پڑھو گے تو نہ صرف یہ کہ پڑھائی آسان ہو جائے گی بلکہ دنیا ہی آسان ہو جائے گی۔ زندگی کے بے شمار اسرار کتابوں سے کھل جاتے ہیں، ایسے سمجھیے کہ یہ کتابیں نہیں بلکہ بند تالوں کی چابیاں ہیں اور کامیابی انہی لوگوں کا مقدر ہوتی ہے جن کے پاس علم ہوتا ہے۔

مریخ اور زہرہ سے آگے مکاں تمھارا
جس سمت جاؤ گے تم سارا جہاں تمھارا

آپ کے نام یہ پہلا خط لکھ رہا ہوں جو یقیناً آپ کی امّاں آپ کو پڑھ کر سنا رہی ہوں گی۔ ابھی تو آپ بہت کم سن ہیں، ہاں اس خط کی کئی باتیں آپ کو سمجھ میں ضرور آئیں گی۔ جب آپ سمجھ دار ہو جائیں گے تو شاید آپ اس خط کو خود ہی پڑھیں گے۔

اپنا خیال رکھیں اور خوب مزے کریں اور خوب پڑھیں۔ دل سے دعا اور سلام......!

السلام علیکم......!

آپ کا ابّو جان

■

Dr. Tauseef Bareilvi
Department of Urdu
Al-Barkaat College of Graduate Studies
Aligarh-202122 (UP)
Mob.: 9058296593

حمیرا عالیہ

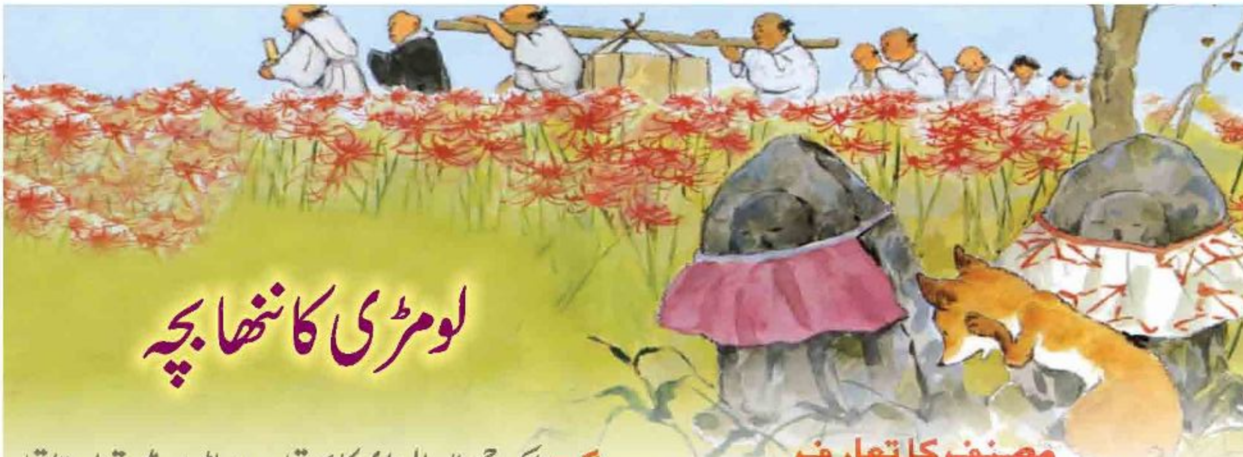

لومڑی کا ننھا بچہ

گون ایک چھوٹا سا لومڑی کا بچہ تھا۔ وہ پہاڑوں میں تنہا رہتا تھا۔ کم عمری میں وہ اپنی ماں سے جدا ہو گیا تھا۔ اس کی ماں انسانوں کے لگائے ہوئے ایک جال میں پھنس کر شکار ہو گئی تھی۔ گون اکثر قریب کے ایک گاؤں میں آجاتا اور خوب شرارتیں کرتا، کبھی وہ کسانوں کے کھیتوں میں چلا جاتا اور وہاں سے سبزیاں چرا لیتا یا کبھی ان کے گھروں میں گھس جاتا اور پھل وغیرہ اٹھا لیتا، جب گاؤں والوں کو اس کی ان شرارتوں کا علم ہوتا تو وہ بہت ناراض ہوتے تھے۔ گون کو ان کا غصہ دیکھ کر خوب مزہ آتا۔

پت جھڑ کا موسم تھا۔ پچھلی رات تیز بارش ہوئی تھی جس کی وجہ سے گون اپنے گھر سے نہیں نکل سکا تھا، لیکن آج موسم اچھا تھا، گون نے سوچا ''واہ آج تو موسم بہت اچھا ہے، آج میں ٹہلنے کے لیے باہر جا سکتا ہوں۔''

گون ندی کی طرف چل پڑا۔ جب وہ ندی کے قریب پہنچا تو اس نے دیکھا وہاں پہلے سے کوئی تھا، اس نے پرانا اور میلا سا کیمونو پہنا ہوا تھا۔ گون تھوڑا اور قریب گیا پھر اس نے پہچان لیا۔

''اوہ! یہ تو ہایوجو ہے...... یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟'' اس نے حیرت سے سوچا۔

ہایوجو ندی میں مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ جو مچھلیاں اس نے پہلے سے پکڑ رکھی تھیں وہ اس نے ایک ڈبے میں بند کر کے درخت کے نیچے رکھی ہوئی تھیں۔ وہ ندی میں غوطے لگا کر

مصنف کا تعارف

نان کچی نیمی (1913-1943) ایک جاپانی مصنف تھے۔ انھوں نے بچوں کے لیے کئی دلچسپ کہانیاں، نظمیں، نرسری نغمے اور ڈرامے لکھے۔ انھیں جاپان کا ہانس کرسچن اینڈرسن بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی پیدائش یانابے، ہانڈا شہر میں ہوئی تھی۔ کم عمری سے ہی ان کی صلاحیتیں ظاہر ہونے لگی تھیں۔ ان کی مشہور کہانیوں میں Gone the Little Fox, Buying Mittens, Grandather's Lamp خاص طور پر مشہور ہیں۔ نان کچی نیمی کی کہانیوں میں کٹ سونے (جاپان کی ماورائی لومڑیاں) کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔

لومڑی کا ننھا بچہ کہانی ایک جاپانی لوک کتھا پر مبنی ہے۔ مصنف نے اسے محض اٹھارہ برس کی عمر میں لکھا تھا۔ یہ کہانی حیرت انگیز طور پر نان کچی نیمی کی زندگی سے مماثلت رکھتی ہے۔ جیسے نان کچی نیمی کی والدہ بھی چار برس کی ننھی عمر میں ان سے جدا ہو گئی تھیں۔ اسی طرح گون کی طرح خود نان کچی نیمی بھی زیادہ دنوں تک زندہ نہیں رہ سکے تھے اور محض 29 برس کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کی یاد میں ہانڈا شہر میں نان کچی نیمی میموریل میوزیم بھی تعمیر کیا گیا ہے۔

مچھلیاں نکال رہا تھا۔ گون ایک پیڑ کے پیچھے سے چھپ کر سب دیکھ رہا تھا، اس نے یہ بھی دیکھا کہ ڈبے میں ڈھیر ساری مچھلیاں تھیں، اچانک اسے پھر ایک شرارت سوجھی، ایک ایک کر کے ساری مچھلیاں جو ڈبے میں بند تھیں گون انھیں اپنے ہاتھوں سے ندی میں واپس پھینکنے لگا..... شراپ شراپ شراپ۔

اب ڈبے میں صرف ایک مچھلی بچی تھی، یہ ایک لمبی سی ایل مچھلی تھی، وہ اتنی بڑی تھی کہ گون اسے اپنے ننھے منے ہاتھوں سے نہیں اٹھا سکتا تھا اس لیے اس نے اپنا سر ڈبے میں گھسایا اور مچھلی منہ میں اٹھالی، اسی وقت ہایوجو زور سے چلایا:

''چور''

گون چونک گیا، وہ واپس پہاڑوں کی طرف بھاگنے لگا، جب وہ اپنے گھر پہنچ گیا تو اس نے مچھلی باہر رکھ دی۔

''واہ! یہ بہت حیرت انگیز تھا، مگر مجھے مزہ آیا'' اس نے خود کلامی کی۔

اس واقعے کے دس دن بعد گون ٹہلتے ہوئے گاؤں پہنچا۔ جب وہ ہایوجو کے گھر کے پاس پہنچا تو اس نے دیکھا وہاں بہت سارے لوگ جمع تھے۔

''یہ کیا؟ یہاں کیا ہوا ہے؟'' اس نے خود سے سوال کیا۔ عورتیں معمول سے بہتر کیمونو پہنے ہوئی تھیں اور وہ کام میں مصروف تھیں۔

''اوہ لگتا ہے گاؤں میں کوئی تقریب ہے۔ یا شاید کوئی مر گیا ہے، لیکن مجھے حیرت ہے کہ کون مر گیا ہے''؟ وہ سوچنے لگا۔

جب گون دیکھ رہا تھا، اسی وقت سب لوگ باہر آنے لگے، ہایوجو بھی باہر آیا، اس نے سفید کیمونو پہنا ہوا تھا۔ ہایوجو ہمیشہ خوش رہتا تھا، لیکن آج گون نے دیکھا، ہایوجو کا چہرہ اداس تھا۔

''اوہ! تو ہایوجو کی ماں کا انتقال ہو گیا''

گون اپنے گھر لوٹ آیا، پھر اس نے سوچا ''ہایوجو کی ماں بیمار تھی، اس دن وہ مچھلی جو میں اٹھالی تھی اسے ہایوجو اپنی ماں کو دینے جا رہا تھا۔ اس کی ماں شاید اس دن مچھلی کھانے کے بارے میں سوچ رہی تھی، اور پھر وہ مر گئی۔ ہایوجو اپنی ماں کو مچھلی نہیں دے سکا۔ جو شرارت میں نے کی تھی وہ مجھے نہیں کرنی چاہیے تھے۔

اگلے دن گون ہایوجو کے گھر کی طرف گیا، وہ اس کے گھر سے کافی دور کھڑا ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔ ہایوجو لال کنویں کے پاس گیہوں دھو رہا تھا۔ پہلے ہایوجو اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا، لیکن اب اس کی ماں یہاں نہیں تھی۔ گون نے سوچا'' میں بھی ہایوجو کی طرح اکیلا ہوں''

اسی وقت کہیں سے مچھلی بیچنے والے کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہا تھا'' سارڈین مچھلی لے لو مچھلی، مزیدار مچھلی، سستی مچھلی۔''

قریب کے گھر سے کسی نے پوچھا'' پلیز کیا میں ایک مچھلی لے سکتا ہوں۔''

مچھلی بیچنے والا اپنا ڈبہ لے کر سڑک کے پار آیا، پھر اس نے ایک مچھلی نکالی اور اس گھر کی طرف چلا گیا۔

گون جلدی سے اس کے ڈبے کی طرف گیا، اس نے وہاں سے 5,6 مچھلیاں اٹھائیں اور ہایوجو کے گھر کی طرف دوڑا۔ پھر وہ ہایوجو کے گھر گیا اور مچھلیاں اندر پھینک دیں، پھر وہ مڑا اور واپس اپنے گھر کی طرف بھاگنے لگا، تھوڑی دور جا کر اس نے مڑ کر دیکھا، ہایوجو ابھی بھی گیہوں دھو رہا تھا۔

''آج میں نے ایک اچھا کام کیا'' اس نے سوچا۔

اگلے دن اس نے بہت سارے اخروٹ اور مشروم جمع کیے اور انھیں لے کر ہایوجو کے گھر کی طرف چل پڑا۔ جب اس نے گھر کے اندر جھانک کر دیکھا تو ہایوجو کھانا کھا رہا تھا، اچانک گون کی نظر اس کے چہرے پر پڑی، ہایوجو کا چہرہ زخمی تھا۔ ''آخر کیا ہوا ہوگا'' اس نے حیرت سے سوچا۔ تب ہی

اسے ہایوجو کی آواز آئی۔ ''کل کسی نے میرے گھر کے اندر مچھلیاں رکھ دیں تھیں، وہ آدمی جو مچھلی بیچ رہا تھا اس نے مجھے چور سمجھا اور مجھے مارا، آہ، مجھے درد ہو رہا ہے۔'' جب گون نے یہ سنا تو اسے بہت حیرت ہوئی۔ اس نے سوچا مچھلی چرا کر اس نے شاید پھر غلطی کر دی۔

''مچھلی بیچنے والے نے سوچا کہ ہایوجو نے مچھلی چرائی ہے، اوہ مجھے معاف کر دو ہایوجو......'' گون نے وہ سارے اخروٹ اور مشروم ہایوجو کے گھر کے سامنے چھوڑ دیے اور واپس لوٹ آیا۔ اگلے چند دنوں تک گون ہایوجو کے گھر اخروٹ اور مشروم لے کر جاتا رہا۔

اگلی رات بہت خوبصورت تھی، گون نے باہر جا کر کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ جب وہ ٹہل رہا تھا تو اس نے کسی کے بات کرنے کی آواز سنی۔ گون ایک درخت کے پیچھے چھپ کر انتظار کرنے لگا، آواز قریب آنے لگی، وہ ہایوجو اور ایک کسان کاسوکے کی آوازیں تھیں۔ کاسوکے ہایوجو کے باپ کی عمر کا تھا اور اس کا خیال رکھتا تھا۔

''جب سے میری ماں مری ہے، ہر روز مجھے اپنے گھر کے باہر نٹس اور مشروم ملتے ہیں، میں حیران ہوں کہ آخر کون انھیں وہاں رکھتا ہے''؟۔ ہایوجو نے بتایا

''سچ میں؟ روزانہ؟، کاسوکے نے پوچھا۔

''ہاں روزانہ''

''مجھے نہیں لگتا کہ یہ گاؤں کا کوئی آدمی ہے، یا یہ خدا ہے، خدا کو معلوم ہونا چاہیے''

''ہوں! کیا ایسا ہے؟''

''جب سے تم اکیلے ہوئے ہو خدا تمھیں کھانا دے رہا ہے'' کاسوکے نے کہا۔

''اگر ایسا ہے تو مجھے ہر روز خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے'' ہایوجو نے کہا۔

گون نے یہ سنا پھر اس نے سوچا ''یہ میں تھا جو ہایوجو کے لیے نٹس اور مشروم لاتا تھا۔ لیکن مجھے شکریہ کہنے کے بجائے یہ خدا کا شکر ادا کر رہا ہے۔ یہ تو ناانصافی ہے۔''

اگلے دن بھی گون اخروٹ اور مشروم لے کر ہایوجو کے گھر گیا۔ ہایوجو اپنے باغ میں بیٹھا ٹوکریاں بنا رہا تھا۔ گون جلدی سے گھر کے اندر گیا۔ اسی وقت ہایوجو کی نظر اس پر پڑی۔

''اوہ! یہ تو وہی لومڑی ہے جس نے میری مچھلی لے لی تھی، یہ ضرور کوئی نیا فتنہ کرنے آئی ہوگی''۔

ہایوجو نے بندوق اٹھائی اور دروازے کی طرف دوڑا۔ عین اسی وقت جب گون اندر داخل ہو رہا تھا، گولی چلی۔

ایک دھماکہ ہوا... اور گون زمین پر گر گیا۔ ہایوجو نزدیک آیا اور گون کے پاس کھڑا ہو گیا۔ تب اس نے دیکھا اس کے گھر کے اندر چاروں طرف اخروٹ اور مشروم بکھرے ہوئے تھے۔

''اوہ خدا'' ہایوجو حیرت سے گون کو دیکھ رہا تھا۔

پھر اس نے کہا:

''گون! یہ تم تھے؟ کیا تم ہی میرے لیے اخروٹ اور مشروم لایا کرتے تھے؟''

زمین پر گرے ہوئے گون نے بند آنکھوں سے ہاں میں سر ہلایا۔

ہایوجو کے ہاتھوں سے بندوق نیچے گر گئی۔ نیلا دھواں اب بھی اس سے باہر آ رہا تھا۔

(جاپانی لوک کتھا سے ماخوذ)

■

Humera Alia
Nadwa Campus, Tagore Marg
Lucknow- 226007 (UP)
Mob.: 9140807085

سیاحت

زینت اختر

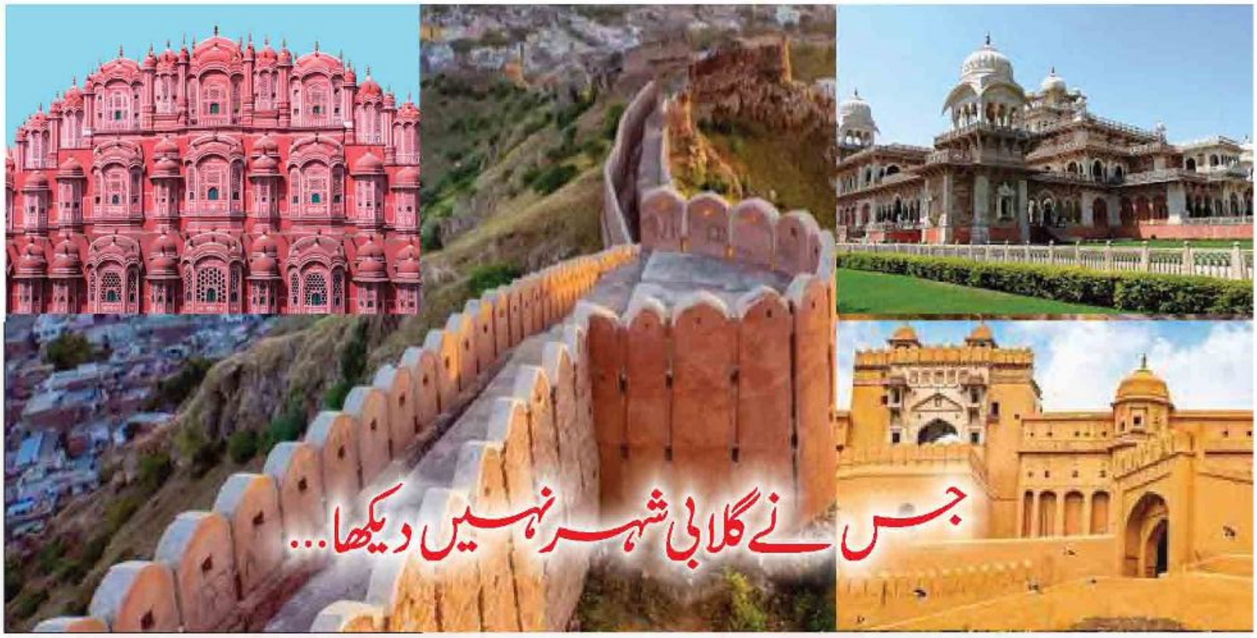

جس نے گلابی شہر نہیں دیکھا...

سابق امریکی صدر بل کلنٹن نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ دنیا میں دو طرح کے لوگ رہتے ہیں، ایک جنھوں نے آگرہ میں واقع تاج محل دیکھا ہے اور دوسرے وہ جنھوں نے دنیا کی اس خوبصورت ترین عمارت کو نہیں دیکھا۔ مگر میرا خیال ہے کہ جس نے بھارت کے مغربی صوبہ راجستھان کا دارالحکومت جے پور نہیں دیکھا اس نے برصغیر میں ہند اسلامی فن تعمیر کے امتزاج کو پوری طرح سے نہیں دیکھا۔

ہند مغل فن تعمیر کا نمونہ آمیر محل، شاعر بادشاہ سوائی پرتاپ سنگھ کا بیچ چوراہے پر تعمیر کیا گیا خوبصورت 'ہوا محل'، جنتر منتر، سٹی پیلس، البرٹ میوزیم، اکبری مسجد، قلعہ آمیر، وغیرہ یادگاریں اس شہر کو ایک منفرد امتیاز عطا کرتی ہیں۔ مغل بادشاہوں کی راجپوت رانیاں بشمول جودھا بائی وغیرہ سبھی کا تعلق اس شہر سے تھا اور برصغیر میں مغل سلطنت کو وسعت اور دوام بخشنے میں راجپوت راجاؤں کا بڑا رول ہے۔ ان میں راجہ مان سنگھ، راجہ بھگوان سنگھ وغیرہ کے نام فوراً زبان پر آجاتے ہیں۔

آزادی کے بعد راجستھان کا صوبہ 82 چھوٹی بڑی شاہی ریاستوں (راج واڑاؤں) کو ملا کر تشکیل دیا گیا۔ ان میں سے ایک ریاست راجپوتانہ تھی، جس کا دارالحکومت پہلے کبھی آمیر ہوا کرتا تھا بعد ازاں راجہ سوائی جے سنگھ دوم نے اپنے نام سے ایک شہر بسایا۔ یہ برصغیر کا غالباً پہلا منصوبہ بند شہر ہے۔ تاریخ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ راجپوتانہ کی ریاست ڈھولا رائے کچھواہا راجپوت نے 769 میں قائم کی اور آمیر کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ راجپوتانہ کے حکمراں مغلیہ سلطنت کے حلیف اور تابعدار تھے۔ یہاں تک کہ ان کے درمیان خاندانی رشتے بھی قائم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ علاقے کی تعمیرات میں مغلیہ فن تعمیر کا جلوہ صاف نظر آتا ہے۔

تاہم راجپوتانہ کے حکمرانوں میں جے پور بسانے کے حوالے سے سوائی جے سنگھ دوم کو عالمی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی جو فارسی و سنسکرت کا عالم اور علم نجوم و فلکیات کا ماہر تھا۔ اس کا دور حکومت 1700 سے 1734 تک رہا۔ 'سوائی' کا

خطاب اسے مغل شہنشاہ نے عطا کیا تھا۔ یہ خطاب عزت و تکریم کا مظہر ہے۔

جب پرانے دارالحکومت آمیر میں آبادی تیزی سے بڑھنے لگی اور پانی کی شدید قلت محسوس ہونے لگی تو سوائی جے سنگھ نے 1727 میں جے پور کو بسایا۔ اس شہر کو بڑے سلیقے اور منصوبہ بند طریقے سے تعمیر کیا گیا۔ اٹھارہویں صدی کی ابتدا میں جب برصغیر میں موٹر گاڑیوں کا کوئی وجود نہیں تھا اس نے کشادہ سڑکیں، اور کشادہ بازار، سڑک کے دونوں اطراف سایہ دار برآمدے، شہر کو دشمن سے محفوظ رکھنے کے لیے چاروں جانب عظیم فصیل اور مضبوط دروازے تعمیر کرائے۔ آج بھی پرانے فصیل بند شہر میں اجمیری گیٹ، چاند پول گیٹ، زور آور گیٹ، گنگا پول گیٹ، سورج پال گیٹ، نیو گیٹ، سانگا نیری گیٹ سے داخل ہو سکتے ہیں۔ چونکہ شہر کی آبادی میں بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے۔ کوہ اراولی کے دامن میں آباد چند ہزار نفوس والے اس شہر کی آبادی اب تیس لاکھ سے متجاوز کر چکی ہے۔ اس لیے اس کا حدود رقبہ بہت زیادہ پھیل گیا ہے۔ شہرۂ آفاق آرکیٹیکٹ مرزا اسمٰعیل بیگ کی ذہانت و قابلیت، نقشہ نویسی اور فن تعمیر نے اس شہر کو عالمی شہرت عطا کر دی ہے جو دنیا بھر کے سیاحوں کی کشش کا مرکز ہے۔

گلابی شہر کی وجہ تسمیہ: 1876 میں پرنس آف ویلز اور ملکہ وکٹوریہ نے ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔ چونکہ مقامی روایات میں گلابی رنگ مہمان نوازی کا مظہر ہے اس لیے اس وقت مہاراجہ رام سنگھ نے انگریز مہمانوں کے استقبال کے لیے پورے شہر کو گلابی رنگ میں رنگ دیا تھا۔ اس کے بعد سے یہ شہر گلابی شہر کے نام سے مشہور ہوا۔

اس شہر میں آمیر کا قلعہ، جے گڑھ قلعہ، موتی ڈونگری محل، ہوا محل، جل محل، جنتر منتر، سٹی پیلس کنک گھاٹی، چندر محل اور رام نواس گارڈن ملکی اور غیر ملکی سیاحوں کے خصوصی توجہ کا مرکز بنتے ہیں۔

قلعہ آمیر: میں نے اپنے حالیہ دورے میں جن چند مقامات کی سیاحت کی۔ ان میں قلعہ آمیر شامل ہے۔ یہ جے پور سے تقریباً 11 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے لیکن آبادی کے بڑھنے کے سبب شہر سے مل گیا ہے۔ سلسلہ کوہ اراولی کی کریگی پہاڑیوں میں واقع یہ قلعہ یونیسکو کے عالمی ثقافتی ورثے کی فہرست میں شامل ہے۔ قلعے میں واقع آمیر محل راجپوت اور مغل طرز تعمیر کا ایک خوبصورت امتزاج ہے۔ راجہ مان سنگھ اول نے 1592 میں تعمیر شروع کی اور راجہ جے سنگھ نے مکمل کیا۔ یہ محل مکمل طور پر سرخ پتھر اور سفید سنگ مرمر سے بنا ہے جس کی شان و شوکت سے سیاح متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔ محل کی عمارتوں میں نقش و نگار، قیمتی پتھروں اور شیشوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ محل کے سامنے واقع ماوتا جھیل سے نظارہ اسے اور بھی دلکش بنا دیتا ہے۔ قلعے میں ایک مسجد بھی ہے جو مغل بادشاہ اکبر کے نام سے اکبری مسجد کہلاتی ہے۔ راجستھان میں تین مسجدیں اکبری مسجد کے نام سے موسوم ہیں۔ ان میں ایک اجمیر درگاہ کے احاطے میں، دوسری آمیر میں تیسری منوہر پور میں آج بھی موجود ہیں۔

جل محل: سیاحوں کی کشش کا ایک اور مرکز 'جل محل' ہے (سنسکرت لفظ جل معنی پانی اور عربی لفظ محل کا مرکب ہے)۔ یہ محل مادھو سنگھ اول نے رہائش کے مقصد سے تعمیر نہیں کرایا تھا۔ یہ شکار کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ محل مان ساگر جھیل کے وسط میں واقع ہے، اس کے پس منظر میں اراولی کی پہاڑیاں ایک خوبصورت نظارہ پیش کرتی ہیں۔ 250 سال قدیم اس محل کی عمارت پانی کی سطح سے یک منزلہ دکھائی دیتی ہے لیکن درحقیقت یہ عمارت چار منزلہ ہے جس کی تین منزلیں زیر سطح

ہیں۔ اس کی پتھر کی دیواریں پانی کے بہاؤ کو روکتی ہیں اور خاص طور پر ڈیزائن کیا گیا چونا مارٹر محل میں پانی کے اخراج کو روکتا ہے۔ یہ محل ایک بڑے جہاز کی طرح جھیل میں تیرتا ہوا نظر آتا ہے۔سرخ پتھر کی دیواروں کا ہلکا رنگ اور نیلگوں پانی کی آمیزش سے صبح کے وقت ایک شاندار منظر پیش کرتا ہے۔ محل میں سیاحوں کے داخلے کی ممانعت ہے۔ شام کے وقت لوگ جھیل کے کنارے آتے ہیں اور اس جگہ پر کافی ہجوم ہو جاتا ہے کیونکہ یہ شہر کی ہنگامہ آرائیوں سے دور ایک پر سکون مقام ہے۔

ہوا محل: یہ پانچ منزلہ عمارت شہر کے قلب میں واقع ہے اور شہد کی مکھیوں کے چھتے کی طرح نظر آتی ہے۔ یہ دنیا کی بلند ترین عمارت ہے جو بغیر ستون کے تعمیر کی گئی ہے۔ اس کا خمیدہ فن تعمیر 87 ڈگری کے زاویے پر جھکتا ہے، اور ایک اہرام کی شکل میں نظر آتا ہے۔ اس میں بے شمار کھڑکیاں اور جھروکھے ہیں جن سے اس کے اندر ہمیشہ ہوا چلتی رہتی ہے۔ اسی وجہ سے اس کا نام ہوا محل رکھا گیا، جس کا لفظی ترجمہ 'ہواؤں کا محل' ہے، اس زمانے میں جب ایئر کنڈیشن کا کوئی نظام نہیں تھا یہ حیرت انگیز قدرتی ایئر کنڈیشن تھا۔ جے پور کا علاقہ تھار کے صحرا سے متصل ہونے کے باعث یہاں درجہ حرارت بہت زیادہ رہتا ہے۔محل کی کھڑکیوں میں رنگین شیشے بھی نصب کیے گئے ہیں جو محل کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہ محل بھی جے پور کے تعمیراتی عجائبات میں سے ایک ہے۔ راجپوت فن تعمیر میں گنبدوں کی چھتوں اور بانسری ستونوں میں دیکھا جا سکتا ہے جبکہ پتھر کی جڑی ہوئی فلیگری ورک اور محراب مغل طرز تعمیر کی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔

سٹی پیلس: یہ عمارت بھی فصیل بند شہر کے مرکزی علاقے میں واقع ہے، اسے بھی بانی جے پور سوائی جے سنگھ نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ مغل اور راجپوت فن تعمیر کا خوبصورت امتزاج ہے۔ اس میں واقع عمارتوں کے نام بھی مغلیہ عمارتوں کی طرح دیوان عام، دیوان خاص، مبارک محل (استقبالیہ) اور ملکہ محل وغیرہ ہیں۔ یہ محل اب بھی شاہی خاندان کی ملکیت ہے جو محل کے ایک نجی حصے میں رہتا ہے۔ اس میں ایک میوزیم بھی ہے۔ اسی لیے اس کا داخلہ ٹکٹ بھی بہت زیادہ ہے۔

جنتر منتر: یہ بھی یونیسکو کے ثقافتی ورثے میں شامل ہے، سوائی جے سنگھ نے جو پانچ رصدگاہیں بنائی تھیں ان میں یہ سب سے بڑی ہے۔ اس میں سولہ جیومٹری کے آلے ہیں جو وقت کی پیمائش، ستاروں اور فلکیاتی اجسام کی گردش کا پتہ لگانے کے کام آتے ہیں۔

البرٹ میوزیم: شہر میں کئی میوزیم ہیں لیکن البرٹ ہال میوزیم سب سے قدیم عجائب خانہ ہے۔ یہ میوزیم لندن کے وکٹوریا اور البرٹ میوزیم کے نام سے موسوم ہے۔ اس کا سنگ بنیاد 1876 میں پرنس آف ویلز نے رکھا تھا جس میں دھات اور لکڑی سے بنی اشیا، اور مجسمے، قالین، ہیرے جواہرات، اسلحہ، ہاتھی دانت کی چیزیں وغیرہ شامل ہیں۔ میوزیم میں ایسی کوئی غیر معمولی چیز نہیں جو اسے دوسرے میوزیموں سے ممتاز کرتی ہے۔

یہ شہر نہ صرف اپنی تاریخی عمارات بلکہ ہیرے جواہرات، دستکاریوں، اور دیگر صنعتوں کے لیے بھی مشہور ہے۔ اسے بھارت کے پیرس سے بھی تشبیہ دی جاتی ہے جس میں سیاحوں کی کشش کا ہر سامان موجود ہے اور وہ ان سے پوری طرح سے محظوظ ہو سکتے ہیں۔

■

Zeenat Akhtar
Flat No.: 9, Jha House
Basti Hazrat Nizamuddin
New Delhi- 110013

رضی اللہ دہلوی

نیکی کا صلہ

سالانہ امتحان کا نتیجہ نکلا تو راشد کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ اپنی کلاس میں پہلی پوزیشن کے ساتھ کامیاب ہوا تھا۔ کلاس کے سب ہی لڑکے راشد کو مبارکباد دینے لگے۔ خود راشد کے کلاس ٹیچر مجیب صاحب نے بھی اسے فرسٹ آنے پر مبارکباد دی۔ انھوں نے راشد کو اپنی طرف سے دس روپے کا نیا نوٹ بھی انعام کے طور پر دیا۔ راشد نے مجیب صاحب کے دیے ہوئے نوٹ کو خوشی خوشی اپنی قمیص کی جیب میں رکھا اور ان سے اپنی رپورٹ بک لے کر تیزی سے گھر کی طرف چل دیا تا کہ اپنے ابا جان اور امی جان کو بھی اپنے فرسٹ آنے کی خوش خبری سنا دے۔

راشد بے حد ہونہار طالب علم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ کلاس میں فرسٹ آتا رہا تھا، اور اب جب اس نے پانچویں کلاس میں بھی پہلی پوزیشن کے ساتھ کامیابی حاصل کی تو اسے بے انتہا خوشی ہوئی، اس لیے کہ اس بار اس کے کلاس ٹیچر مجیب صاحب نے اسے فرسٹ آنے کی مبارک باد دینے کے ساتھ دس روپے کا نیا نوٹ بھی انعام میں دیا تھا۔ راشد ابھی نئے نوٹ کے خیالوں میں کھویا ہوا اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا۔

راشد کا گھر اسکول سے تھوڑے ہی فاصلے پر سڑک کے کنارے تھا، لیکن آج اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میلوں دور ہو اور دنوں کی نسبت وہ آج کافی تیز چل رہا تھا پھر بھی جیسے اس کا گھر اور دور اور دور ہوتا جا رہا تھا۔

چلتے چلتے راشد کو ماسٹر صاحب کے دیے ہوئے نوٹ کا پھر خیال آیا، اس نے سوچا کیوں نہ وہ اس نوٹ کی ادریس حلوائی سے گرم گرم جلیبیاں لیتا چلے اور ابا جان، امی جان کو اپنے فرسٹ آنے کی خوش خبری سنانے کے ساتھ ان کا منہ بھی میٹھا کرا دے۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک درد بھری آواز نے اسے چونکا دیا۔

"دو دن سے بھوکا ہوں بابو جی— تھوڑی سوکھی باسی روٹی مل جائے اللہ کے نام پر... اللہ اس کا اجر دے گا۔"

راشد نے چونک کر پلٹ کر دیکھا۔

اس کے سامنے ایک اندھا فقیر پیپل کے درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس فقیر کے جھریوں بھرے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ واقعی بہت بھوکا ہے۔ بھوک کی وجہ سے اس کی آواز بھی ٹھیک طرح نہیں نکل رہی تھی۔ راشد کو اس اندھے فقیر پر بے حد ترس آیا اس نے کچھ سوچ کر گھر جلیبیاں لے جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنی قمیص کی جیب سے اپنا انعام دس روپے کا نوٹ نکال کر سامنے کلچے چھولے والے کی ریڑھی کے قریب گیا اور ریڑھی والے سے دو روپے کے کلچے چھولے خرید کر فقیر کے حوالے کرتے ہوئے بولا "بابو— یہ کھالو، کلچے چھولے ہیں۔"

کلچے چھولے کا نام سن کر فقیر کے مایوس چہرے پر خوشی کی جھلک آ گئی۔ اس نے راشد کو بہت سی دعائیں دے کر اس کے ہاتھوں سے کلچے چھولوں کا پتہ لے لیا اور جلدی جلدی کھانے لگا۔

راشد تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ راشد کا گھر بالکل قریب آ گیا تھا۔ صرف سڑک پار کرنا باقی تھا وہ تیزی سے قدم

بڑھتا ہوا سڑک پار کر رہا تھا۔ فرسٹ آنے کی خوشی کا نشہ راشد پر اتنا چڑھا ہوا تھا کہ اسے اتنا بھی ہوش نہ رہا کہ اس کے دائیں طرف سے سڑک پر ایک بس بہت تیز رفتار سے چلی آرہی ہے۔ وہ تو جلدی سے سڑک پار کر رہا تھا۔

بس کے ڈرائیور نے جب دیکھا کہ راشد بس سے بچنے کی بالکل کوشش نہیں کر رہا ہے تو وہ زور زور سے ہارن بجانے لگا، تا کہ راشد سڑک سے ہٹ جائے، لیکن راشد برابر بیچ سڑک میں چلتا رہا۔

چند لمحوں بعد بس راشد کے بالکل قریب آ گئی۔

اب راشد کو بچانے کے لیے بس کے ڈرائیور کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ بس روک لے اسی لیے اس نے اپنی پوری طاقت سے بس کے بریک دبا دیے۔

بس الٹتے الٹتے بچی، لیکن رک گئی۔

مگر راشد نہ بچ سکا۔ وہ بس سے ٹکرا کر گر گیا اور بے ہوش ہو گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد سڑک کا سارا ٹریفک رک گیا اور سیکڑوں لوگوں کی بھیڑ بس کے گرد جمع ہو گئی، راشد بس کے پاس بے ہوش پڑا تھا۔

راشد کو ہوش آیا تو اسے پتہ چلا کہ اس کا دایاں پاؤں پلاسٹر کی پٹیوں سے جکڑا ہوا ہے اور وہ ہسپتال کے بیڈ پر لیٹا ہوا کراہ رہا ہے۔ اس کے پلنگ کے دائیں طرف ڈاکٹر صاحب گلے میں آلہ ڈالے کھڑے تھے۔ ان کے ساتھ دو نرسیں بھی تھیں۔ پلنگ کے بائیں طرف اس کے ابا اور امی کھڑے تھے۔

راشد کو ہوش میں آتے دیکھ کر اس کی امی کی جان میں جان آئی اور وہ اپنے ریشمی رومال سے راشد کے ماتھے کا پسینہ پونچھتے ہوئے ایک دم بول اٹھیں: ”بیٹے تم ہوش میں آ گئے! اچھے تو ہو تم؟ تمھارے پاؤں میں درد ہو رہا ہے کیا؟“

لیکن راشد کچھ نہ بولا، وہ برابر روئے جا رہا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کبھی ڈاکٹر کو، کبھی اپنے پاؤں کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا— ”میرے پاؤں کو کیا ہو گیا ہے؟ میں کہاں ہوں؟ یہ ڈاکٹر اور نرسیں میرے پاس کیوں کھڑی ہیں؟ تو کیا یہ ہسپتال ہے؟ اگر ہسپتال ہے تو میں یہاں کب اور کیسے پہنچ گیا۔“ راشد کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا آخر اس نے تھک ہار کر روتے روتے اپنی امی سے پوچھ ہی لیا ”میرے پاؤں کو کیا ہو گیا ہے، امی؟“

”کچھ نہیں۔“ راشد کی امی نے اس کی آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے تسلی دینے کے انداز میں کہا: ”معمولی فریکچر ہوا ہے، جلد ہی ٹھیک ہو جائے گا۔“

فریکچر کا نام سن کر راشد جیسا ہمت والا لڑکا بھی گھبرا گیا۔ اس نے اپنے پاؤں کی طرف دیکھا، جس میں اب بھی سخت درد ہو رہا تھا اور وہ کراہ اٹھا۔

راشد کو کراہتے دیکھ کر اس کے ابا بولے ”بیٹے گھبراؤ نہیں ہمت سے کام لو۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے اپنے رحم و کرم سے تمھیں بچا لیا، ورنہ آج تو...“

”ہاں بیٹے“ راشد کی امی نے بھی کہا ”نہ جانے آج کون سی نیکی تمھارے کام آ گئی جو تم بچ گئے، ورنہ ہم تو یہ سنتے ہی کہ تمھارا بس سے ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے، اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے۔“

نیکی اور بس کا ایکسیڈنٹ سن کر راشد کو سب کچھ یاد آ گیا۔ اسے وہ فقیر بھی یاد آ گیا جو بہت بھوکا تھا اور جس پر ترس کھا کر اس نے اسے کلچے چھولے کھلائے تھے اور پھر راشد سمجھ گیا کہ نیکی کبھی رائیگاں نہیں جاتی، انسان کو نیکی کا صلہ ضرور ملتا ہے۔

■

ماخذ: ماہنامہ 'کھلونا'، **نگران:** یوسف دہلوی، **مدیر:** الیاس دہلوی، **اشاعت:** نومبر 1977

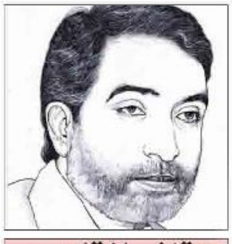

اچھے چاچا اور دیگر ڈرامے

حقانی القاسمی

ادب کی کون سی صنف بچوں کی ذہنی تربیت، عصری آگہی، کردارسازی کے لیے زیادہ ضروری ہے؟

یہ سوال بہت اہم ہے۔ بچوں کے لیے شاعری، کہانی وغیرہ کا ایک وافر ذخیرہ ہے جس سے بچوں کا ذہنی افق وسیع ہوتا ہے، مگر جس صنف سے بچوں کی تخیلی قوت، حرکت وعمل میں اضافہ ہوسکتا ہے وہ ڈراما ہے۔ کیونکہ یہ صنف بچوں کی ذہنی ساخت اور سرشت سے زیادہ مناسبت رکھتی ہے۔ بچے دیکھ کر ہی چیزیں سیکھتے ہیں اور پھر نقل بھی کرنے لگتے ہیں۔ ڈراما اس کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔ یہ صرف تفریح اور تفنن طبع نہیں بلکہ تدریب و تربیت کا بھی ایک اہم وسیلہ ہے۔ ڈرامے کے ذریعے بچوں میں خوداعتمادی، تنقیدی سوچ، ترسیلی قوت کے علاوہ Open-ended approach پیدا کیا جاسکتا ہے۔

اردو میں بچوں کے لیے بہت سے ڈرامے لکھے گئے ہیں۔ امتیاز علی تاج (انوکھا دربار)، نور الٰہی محمد عمر (بور کا لڈو، بڈھا طوطا)، چراغ حسن حسرت (میاں ظفر نکالے گئے)، ڈاکٹر ذاکر حسین (کھوٹا سونا)، عابد حسین (مجموعہ 'آؤ ڈراما کریں')، کرشن چندر (گیند)، غلام عباس (جادو کا گھر، جل پری)، مرزا ادیب (بچوں کا مشاعرہ، ایک مسافر)، اطہر پرویز (گلیلی گلیلیو)، عبدالغفار مدھولی (چھوٹا لڑکا، بچوں کا انصاف، اسکول کی زندگی)، اظہر افسر (پکے آم، مسافر+ بچوں کے ڈرامے)، کمال احمد رضوی (جادو کی بوتل، خوب صورت شہزادی، سمندر میں نمک، ہوشیار بلی، ذہن کی تلاش میں)، آفاق احمد (ڈرامے بچوں کے لیے)، شہناز نبی (جنگل میں اسکول، اٹھ جاگ مسافر+ بچوں کے ڈرامے - بنگلہ سے ترجمہ)، بانو سرتاج (یک بابی ڈرامے)، آفتاب حسنین (ڈرامین)، ایم مبین (رانگ نمبر، میرا نام کرے گا روشن، پپو پاس ہوگیا)، اقبال نیازی (بچوں کے سو ڈرامے، گرگٹ، ایک نئی اڑان، دس رنگی تماشے)، مجید مجازی (گنہگار میں نہیں) ڈرامے کے اہم نام ہیں۔

ظہیر انور بھی انھی ڈراما نگاروں میں سے ایک ہیں جنھوں نے بچوں کے لیے وہ ڈرامے لکھے ہیں جن سے بچے کی فکر اور شعور پہ مثبت اور صحت منداثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔ انھوں نے ایسے ڈرامے تحریر کیے ہیں جن سے نہ صرف عصری زندگی کے مسائل کی تفہیم میں مدد ملتی ہے بلکہ ان ڈرامے کے کرداروں اور مکالموں سے بچوں کے اندر جوش، جذبہ اور تحرک بھی پیدا ہوسکتا ہے۔

ظہیر انور بنیادی طور پر ڈرامے کے ناقد و عالم ہیں اور اداکار و ہدایت کار بھی۔ بچوں کے لیے ڈرامے بھی اسٹیج کرتے رہے ہیں۔ 'اچھے چاچا اور دیگر ڈرامے' کے عنوان سے ان کی جو کتاب ہے اس میں انھوں نے کچھ اہم سوالات اٹھائے ہیں۔ بنیادی طور پر ان کا زور تھیٹر ان ایجوکیشن (Theater in Education) پر ہے۔ وہ تھیٹر کے ذریعے بچوں کو اس آرٹ فارم سے روشناس کرانا چاہتے ہیں جس سے بچوں کو بہتر طور پر باشعور بنایا جاسکتا ہے۔ انھوں نے بچوں کے ڈراموں کے حوالے سے یہ سوالات قائم کیے ہیں:

"کتنے ڈرامے بچوں کے لیے لکھے گئے؟ کون سا تھیٹر گروپ ہے جو بچوں تک اپنے ڈراموں کو لے کر پہنچ سکا ہے؟ کس ہدایت کار یا ڈراما نگار نے، بجز چند بزرگوں کے، بچوں کو اپنے ڈراموں سے جوڑ کر ڈرامے لکھے ہیں؟ ہمارے بچوں کے تھیٹر/ ڈرامے کی صورت حال کیا ہے؟ یا ہے بھی کہ نہیں؟ کیا کسی نے بچوں کو سنجیدگی سے مافوق الفطری کہانیوں، راجا رانیوں،

فنطاسیہ سے منسلک اور خالص طلسماتی کہانیوں کے علاوہ، پریوں، دور دیش کے راجاؤں، نٹ نٹنیوں، ڈائنوں کی کہانی (ڈراما نہیں) کے علاوہ کبھی دل بستگی، کچھ سماجی یا جہاں بینی کے راز سے قریب تر کرنے کی کوشش کی ہے؟'' (ص10)

ظہیر انور کے ان سوالات پر موجودہ عہد میں غور کرنے کی شدید ضرورت ہے کیونکہ عہد قدیم سے عہد حاضر تک بچوں کے لیے شاعری اور کہانی کا اتنا سرمایہ موجود ہے کہ شاید مزید کی گنجائش نہیں رہی۔ الا یہ کہ شاعری اور کہانی عصری مطالبات، موضوعات اور ترجیحات سے ہم آہنگ ہو اور سائنسی اور تکنیکی زاویوں پر بھی زور ہو۔

'اچھے چاچا اور دیگر ڈرامے' میں درج ذیل ڈرامے شامل ہیں: ایک دن گاؤں میں، چڑیا گھر کی سیر، اچھے چاچا 7-1، گورا، انصاف پسند بادشاہ، پیاری رانی کی تمنا، واپس دے دو۔ یوں تو تمام ڈرامے بچوں کے لیے بہت مفید ہیں مگر چاچا سیریز کے ڈرامے بہت سے اعتبارات سے، بچوں کے ذہن کے دریچے کھولنے والے ہیں، خاص طور پر چاچا کے مکالمے، نہایت فکر انگیز اور معنی خیز ہیں۔

دراصل یہ چاچا کی صورت میں ایک بیدار باشعور، باخبر ذہن ہے جو ہر گام پر رہنمائی کے فرائض انجام دیتا ہے۔ چاچا بچوں کے لیے ایک طرح سے مرشد اور مینٹر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چاچا کے مکالموں میں تجربات محسوسات اور مشاہدات کا ایک جہان آباد ہے، ڈائیلاگ میں زندگی آمیز اور زندگی آموز جملے ہیں۔ حکمت و دانش سے معمور بصیرت افروز فقرے...... دو تین اقتباسات ملاحظہ فرمائیں:

''پپو: کیا چاچا؟

اچھے چاچا: ہمیشہ سچ بولو، بغیر کسی ڈر کے، بنا کسی خوف کے، صرف سچ بولو، آسمان پر ستارے دیکھتے ہونا۔

پپو: جی ہاں!

اچھے چاچا: سچ بھی ویسا اجلا چمکتا ستارہ ہے بیٹا۔ یہ تمھارے دل کے اندر جگ مگ جگ مگ کرتا ہے اور تمھارے اندر جو ڈر کا اندھیرا ہے اسے دور کر دیتا ہے۔'' (اچھے چاچا-1)

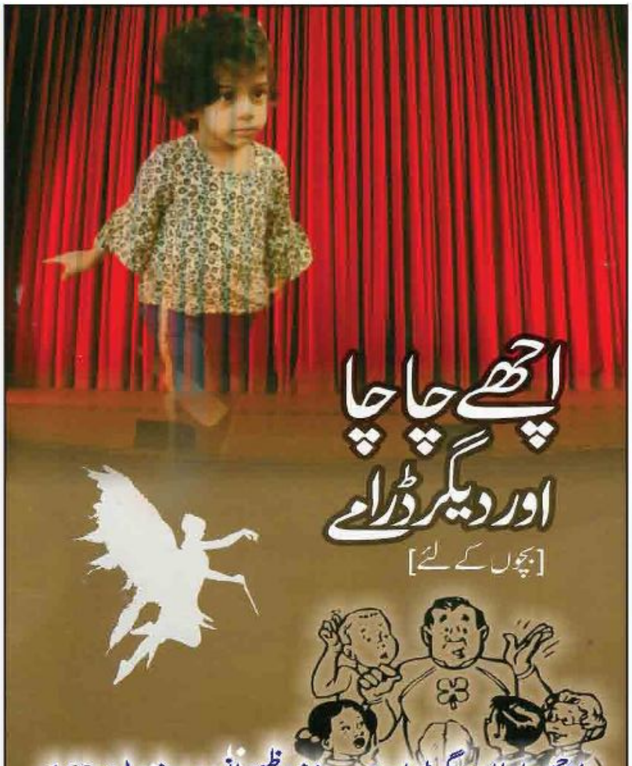

اچھے چاچا اور دیگر ڈرامے مصنف: ظہیر انور، صفحات: 168
قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2022، رابطہ: 1/11
ہری پوکھر فرسٹ لین، کولکاتا-700019، موبائل نمبر 9831260504

○

''گوتم: ارے کیوں بھولیں گے چاچا، ہم پاگل تھوڑے ہیں۔

اچھے چاچا: بیٹا سچ ہے، شہر میں پیسہ اڑتا ہے۔ دیکھتے دیکھتے کوئی بھی کچھ کر سکتا ہے اور کہیں بھی پہنچ سکتا ہے، ترقی وہ ہے جو پورے سماج کو روشنی دے۔ لیکن شہر کی چکاچوندھ میں آدمی کے اندر کا دیا بجھ جائے تو وہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ جاؤ ضرور، مگر آنکھیں کھلی رکھنا، ماں باپ کی یاد سجائے رکھنا، وقت بے وقت آکر مل لینا، خراب راستوں میں مت چلے جانا، اور یہ سب اسی وقت ہوگا جب تم اپنے اندر کا دیا جلا رہنے دو، وہاں ایسی ہوا چلتی ہے کہ سب کچھ بجھ سکتا ہے تم کو بہت ہوشیاری سے زندگی کی گاڑی چلانی ہے۔ اگر ماں باپ کہتے ہیں تو کچھ دن رک جاؤ۔'' (اچھے چاچا-5)

○

''اچھے چاچا: بیٹا، ترقی کرنا اچھی بات ہے لیکن یاد رہے کہ میں

نے کہا تھا اندر کا دیا بجھنے نہ پائے، شہر میں ہوا تیز چلتی ہے، ارے اسی دیا کی روشنی اور اندر کی کرن سے تو تم اپنے ماں باپ اپنے گاؤں اور اپنے ملک کو پہچان لیتے ہو، شہر میں سب کچھ ملتا ہے، سب کچھ خریدا جاتا ہے، نہیں خریدی جاسکتی تو یہ اندر کی کرن۔ عزتیں بک جاتی ہیں، ذلتیں بھی بک جاتی ہیں لیکن اندر جو کرن سہمی بیٹھی ہے نا، وہ تمھیں بتاتی ہے کہ ماں باپ کو پریم اور محبت سے یاد کرو، انھیں خوش ہونے کے لیے سب کچھ دو، دینے کی خوشی کے لیے دو، بیٹے دکھاوے کے لیے نہیں۔ اس روشنی پر تمھاری ماں تمھارے باپو، تمھارے گاؤں کا بھی حق ہے۔''

(اچھے چاچا-5)

یہ صرف جملے نہیں ہیں، مختصر جملوں میں حیات وکائنات کی وہ حقیقتیں ہیں جن کو جاننے اور سمجھنے کے لیے ایک عمر درکار ہوتی ہے۔ چچا یہاں 'چچا' ایک ایسے کردار کے طور پر سامنے آتے ہیں جنھیں 'خضر راہ' کہا جاسکتا ہے۔ ان کے سارے مکالموں میں بڑی معنویت مضمر ہے۔ ان سے بچوں کے ذہن کے جالے بھی دور ہوں گے اور انھیں ایک ایسا راستہ بھی دکھائی دے گا جو منزل تک پہنچانے میں مددگار ثابت ہوگا۔

ان ڈراموں کے علاوہ اس کتاب میں کچھ ماخوذ ڈرامے بھی ہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور کے مشہور ناول 'گورا' انھوں نے ڈرامائی تشکیل کی ہے اور کچھ بنگلہ ڈراموں کو اردو روپ دیا ہے جن میں انصاف پسند شہنشاہ، پیاری رانی کی تمنا کے علاوہ ماخوذ ڈراموں میں : برسیول وائلڈ کا ڈراما 'دی ریفینڈ' کا اردو روپ 'واپس دے دو' قابل ذکر ہیں۔

بچوں کے لیے یہ ڈرامے بہت سے مفید ہیں۔ ان سے بچوں کو زندگی سے جڑے ہوئے بہت سے امور اور معاملات کو سیکھنے اور سمجھنے کا موقع مل سکتا ہے۔ ان ڈراموں سے ان کی ذہنی اور اخلاقی نفسیاتی تربیت بھی ہوسکتی ہے۔ دوسرے ممالک میں ڈرامے کے ذریعے بچوں کی تربیت کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ جرمنی میں 'گرپس' (Grips) نام کا ایک گروپ ہے جو بچوں کی نفسیات کو سامنے رکھتے ہوئے ڈرامے اسٹیج کرتا ہے جہاں بچوں کے مسائل اور ان کی داخلی، ذہنی کیفیات پر کافی تحقیق کی جاتی ہے۔ اس کے بعد ڈرامے تحریر کیے جاتے ہیں اور اسٹیج بھی۔ ضرورت ہے کہ آج کے عہد میں اس فن ڈراما کا احیا کیا جائے اور اسٹیج ڈرامے کے ذریعے بچوں کے اندر ذہنی اور تخلیقی تحرک پیدا کیا جائے۔

ظہیر انور نے ایک بات بہت اچھی یہ لکھی ہے کہ ''اسکول کے بچوں کے لیے تھیٹر گیمس کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ کھیل کھیل میں علم کے راستے سے ہوکر گزرتے ہیں اور اسی کھیل میں اگر ان کی اختراعی کیفیت کو بروئے کار لایا جائے تو سارا کچھ Fun کے راستے سے حاصل ہوگا اور کسی بچے کو Dull نہیں کہنا پڑے گا۔ بچوں کے اندر بے پناہ امکانات ہوتے ہیں۔ جب وہ اپنے اندر کے پوشیدہ امکانات کو سمجھ کر اپنے جسم، اپنی زبان، اپنی ذہنی استعداد، جسم و جان اور اذہان میں ہم آہنگی کی طرف مراجعت کر پائیں گے تو مکمل انسان بن سکتے ہیں...... لہٰذا تھیٹر گیمس کو اردو ڈراموں اور بچوں کے ڈراموں کے احیا کے لیے نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔''

ظہیر انور نے ان ڈراموں کے ذریعے بچوں کی ذہنی، جذباتی اور باطنی زندگی کو ایک نئی سمت اور اڑان دینے کی کوشش کی ہے اور اس مستقبل کو تراشنے پر زور دیا ہے جس پر ملک کی ترقی کا دار ومدار ہے اور وہ مستقبل ہمارے آپ کے بچے ہیں! ننھے منے پیارے پیارے پھول سے بچے، جنھیں سلیقے سے تراشا جائے تو وہ کامیابی اور کامرانی کا جلی عنوان بن سکتے ہیں!

■

Haqqani Al-Qasmi
B-145/8, Thokar No.: 8, Shaheen Bagh
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi- 110025
Mob.: 9891726444

محمد خلیل

لیچی: پیاس کو کم کرنے والا پھل

جب شدید گرمی کا موسم ہوتا ہے اور زمین بہت گرم ہو جاتی ہے۔ اس وقت قدرت کی ایک نعمت لیچی ہماری پیاس بجھاتی ہے۔ اس طرح گرمی کے موسم کا ایک پھل لیچی بھی ہے۔ لیچی ہندوستان کے علاوہ چین اور برما میں بھی پائی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ لیچی کی پیدائش چین میں ہوئی تھی۔ اس کی دریافت 86 سال قبل مسیح ہوئی تھی۔ چین کے لوگ اسے لائی چی کہتے ہیں۔

چینی مصنف شائی میانگ نے لیچی کے بارے میں سب سے پہلے کتاب لکھی تھی۔ کہتے ہیں بودھ حکومت کے دور میں ایک چینی شخص ہندوستان میں سب سے پہلے لیچی لایا تھا۔ بہار میں شہر مظفر پور، یو پی، دہرہ دون اور سہارنپور کے پھل پٹی اس کی پیداوار کے خاص علاقے ہیں، لیکن اپنی خاصیت کی وجہ سے یہ ساری دنیا میں مشہور ہے۔ اس کی سب سے زیادہ پیداوار چین میں ہوتی ہے۔ وہاں اس کی سیکڑوں قسمیں پائی جاتی ہیں۔ چین کے بعد ہندوستان دوسرا ملک ہے، جہاں اس کی پیداوار سب سے زیادہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس کی پیداوار ہندوستان میں تقریباً 13 ہزار ہیکٹر کے رقبے میں کی جاتی ہے جس میں 75 فیصدی علاقے شمالی بہار میں ہیں۔ مگر یہ ملک کے مختلف حصوں میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ بیرونی ممالک میں بھی پیدا ہوتی ہے مثلاً امریکہ، افریقہ، نیوزی لینڈ اور سوئٹزرلینڈ کے علاوہ بھی کئی ممالک میں پائی جاتی ہے۔

لیچی کے درخت کی لمبائی چالیس فٹ تک ہوتی ہے۔ یہ درخت چاروں طرف پھیل کر تقریباً گولائی نما ہو جاتا ہے۔ دیکھنے میں بے حد خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ لیچی کے پھل میں گودا تقریباً 77 فیصد ہوتا ہے، جب کہ اس میں پانی کی مقدار 90 فیصد ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ لیچی میں آئیسکاربک ایسڈ، سائیٹرک ایسڈ، پروٹین، چینی، کاربوہائیڈریٹ، کیلشیم، فاسفورس، لوہا اور کئی معدنی اجزا پائے جاتے ہیں۔ شروع میں

صحت

گودے میں پانی کی موجودگی کافی کم ہوتی ہے اور گودا کھٹا رہتا ہے، لیکن پکنے پر گودے میں پانی کی مقدار بڑھ جاتی ہے، جو پیاس کی شدت کو کم کرتی ہے۔ اس کا نباتاتی نام لیچی چائینشیم ہے۔ یہ درختوں پر گچھوں کی شکل میں ہری سرخ کانٹے دار لیچی لٹکتی دکھائی دیتی ہے۔ یہ ایک نازک پھل ہے، اس طرح اس کی دیکھ بھال بڑی احتیاط سے کرنی پڑتی ہے۔ اس کے درخت میں بیماری کم ہی لگتی ہے، لیکن ڈیڑھ ماہ تک دیکھ بھال ضروری ہے۔

کہتے ہیں کہ لیچی کے باغ میں شہد کی مکھیوں کے ڈبے کو رکھ دیا جائے تو اس کی فصل بقول ماہرین 40 فیصد بڑھ جاتی ہے۔ کہتے ہیں لیچی کا درخت سو سال تک پھل دیتا رہتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق لیچی کے ایک درخت میں اور ایک موسم میں تقریباً چار ہزار پھل ہوتا ہے۔ لیکن لیچی کا موسم بہت مختصر ہوتا ہے۔

عام طور پر لیچی ایک مہینے میں ختم ہوجاتی ہے۔ لیچی کے شہد میں ایک خاص قسم کی خوشبو پائی جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں تازہ لیچی کھانا پسند کرتے ہیں اور اس کا شربت بھی کثرت سے لوگ پینا پسند کرتے ہیں۔ جب کہ چین میں لیچی کو لوگ خشک کر کے کھاتے ہیں۔

ہندوستان میں لیچی کی تقریباً تیس قسمیں پائی جاتی ہیں۔ لیچی کے درخت کی جڑ اور چھال کو ابال کر غرارہ کرنے سے گلے کی خراش میں کمی ہوجاتی ہے۔ لیچی کے بیج سے آنتوں کی دوا تیار کی جاتی ہے۔ لیچی کا موسم ختم ہونے پر بھی آپ اس کی لذت سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔ چاہے اسکوئیش کی شکل میں۔

■

Mohammad Khalil
H-51, Dr. Iqbal Lane
Batla House, Jamia Nagar
New Delhi-110025

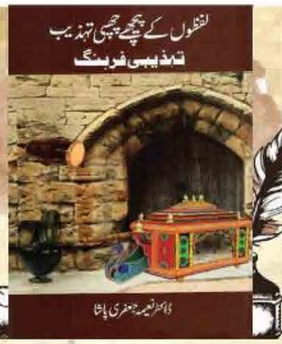

ساز و سامان تحریر

زبان صرف لفظ شناسی سے عبارت نہیں ہے بلکہ زبان تہذیب سے جڑی ہوئی ہے۔ مختلف ثقافتوں اور علاقوں سے اردو نے الفاظ لیے ہیں۔ ان لفظوں کی اپنی ایک معنویت ہے۔ چونکہ الفاظ سے تہذیب کا ایک رشتہ ہوتا ہے اس لیے تہذیب کو سمجھنے کے لیے ان لفظوں سے آشنائی بہت ضروری ہے۔ بہت سارے لفظ اب گم ہوتے جارہے ہیں، کیونکہ ہماری تہذیبی قدریں تبدیل ہوگئی ہیں۔ ان لفظوں کو بچوں کے ذہن میں نقش کرانا اس لیے ضروری ہے تاکہ وہ پرانی تہذیب کو بھی سمجھ سکیں۔ بہت سے الفاظ شاید مستقبل قریب میں ہمارے استعمال سے باہر بھی ہوسکتے ہیں اس لیے ہمارے لیے ان لفظوں سے واقفیت بھی لازمی ہے۔

'ساز و سامان تحریر' کے تحت جن اشیا کا ذکر کیا گیا ہے ان سے ہم سب کے شب و روز کا تعلق ہے، اس میں بستہ، دوات، سیاہی، فاؤنٹین پین، قلم دان، نب وغیرہ کے تعلق سے مکمل معلومات فراہم کی گئی ہے تاکہ بچے ان اشیا کے بارے میں صحیح طور پر جان سکیں اور سمجھ سکیں۔ دراصل یہ ایک طرح سے تہذیبی فرہنگ ہے جس میں لفظوں کے پیچھے چھپی ہوئی تہذیب کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا کی عمدہ کاوش ہے جس میں انھوں نے بہت سے الفاظ اصطلاح اور محاورے کے معانی و مطالب تحریر کیے ہیں۔ یہ کتاب بڑوں کے ساتھ ساتھ بچوں کے لیے بھی بہت مفید ہے۔

دستہ: (فارسی، اسم، مذکر)

کاغذوں کا بنڈل۔ ایک سائز کے بہت سے کاغذوں کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ اوپر تلے رکھ دیا جاتا ہے جسے دستہ یا کاغذوں کا دستہ کہا جاتا تھا۔ عام طور پر 24 کاغذوں کا ایک دستہ ہوتا تھا۔

دست فارسی میں ہاتھ کو کہتے ہیں۔ اسی سے دستہ بنا ہے۔ ہر وہ چیز جسے ہاتھ میں پکڑ کر کام کیا جائے۔ اس کے آگے دستہ لگتا ہے۔ خاص طور پر جب کئی چیزوں کو ایک ساتھ ملا کر پکڑا جائے جیسے گل دستہ، یعنی بہت سے پھولوں کا اکٹھا کیا ہوا گچھا یا فوج کا دستہ وغیرہ، لیکن لکھنے پڑھنے کے سامان میں 24 کاغذوں کے بنڈل کو ہی دستہ کہتے تھے۔ آج کل اس کے لیے بھی انگریزی لفظ Rim استعمال ہونے لگا ہے۔

دوات (عربی، اسم، مونث)

سیاہی رکھنے کی بوتل یا شیشی، پرانے زمانے میں جو لکھائی ہوتی تھی اس میں قلم کو سیاہی میں ڈبو ڈبو کر لکھا جاتا تھا۔ اس لیے دوات لکھنے پڑھنے کے سامان میں بہت اہمیت رکھتی تھی۔ چاہے تختی لکھنا ہو یا جی نب کے قلم سے انگریزی لکھنا ہو یا کسی بھی عام نب اور ہولڈر سے لکھائی کرنی ہو دوات ضروری ہوتی تھی، کیونکہ ان سارے قلموں میں سیاہی بھرنے کا کوئی خانہ نہیں تھا۔ دوات میں ڈبوتے جاتے تھے اور لکھتے جاتے تھے۔ دواتیں عام طور پر کانچ کی بنی ہوتی تھیں۔ بعد میں جب فاؤنٹین پین کا رواج آگیا تب اچھے قسم کی سیاہی کی دواتیں بازار میں بھی ملنے لگی تھیں۔ دوات رکھنے کے لیے ایک اسٹینڈ بھی آتا تھا کیونکہ لکھتے ہوئے دوات کے ٹیڑھا ہوجانے یا گر کر ٹوٹ جانے کا ڈر

بنا رہتا تھا۔ حد یہ ہے کہ اسکول میں بھی دوات لے جانی پڑتی تھی۔ حالانکہ اس کی وجہ سے بچوں کے ہاتھوں، کپڑوں اور کتابوں پر سیاہی کے دھبے لگ جاتے تھے لیکن اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ جیسے جیسے قلم کی قسموں میں ترقی ہوتی گئی سیاہی اور دوات کا استعمال بھی ختم ہوتا گیا۔ آج کل بال پین اور جیل پین کا زمانہ ہے جن میں ریفل پڑی ہوتی ہے۔ دوات اور سیاہی کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔

ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس زمانے میں اردو کے پہلے قاعدے میں 'د' سے دوات اور ہندی کی پہلی کتاب میں (د) سے دوات یاد کی جاتی تھی، لیکن اب اردو اور ہندی کی پہلی کتابوں سے بھی دوات غائب ہوگئی، کیونکہ بچے نہ تو دوات کو سمجھتے ہیں اور نہ پہچانتے ہیں۔

سیاهی (فارسی، اسم، مونث)

لکھنے کے لیے استعمال ہونے والا پتلا مادہ جس میں قلم ڈبو کر تحریر لکھی جاتی تھی۔ اسے روشنائی بھی کہتے تھے کیونکہ اس سے تحریر روشن اور صاف نظر آتی تھی۔ سیاہی سیاہ رنگ سے بنی ہے اس لیے زیادہ تر تختی پر لکھنے والی سیاہی کالے رنگ کی ہوتی تھی۔ یہ گھروں میں بنائی جاتی تھی۔ کالے رنگ کی پڑیا ملتی تھی جنھیں دوات میں ڈال کر تھوڑا پانی ملا لیا جاتا تھا اور ایک چھوٹا سا کپڑے کا ٹکڑا بھی ڈال لیا جاتا تھا تاکہ سیاہی میں رنگ کی کوئی گٹھلی رہ جائے تو کپڑا اسے جذب کرلے۔ سیاہی کو روشنائی کا نام اس لیے بھی دیا گیا کیونکہ سیاہی صرف کالی ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ نیلی، لال اور ہری بھی ہوتی تھی۔ تختی پر تو کالے رنگ سے ہی لکھا جاتا تھا لیکن کاغذ پر کسی بھی رنگ سے لکھا جاتا تھا۔ زیادہ تر سیاہی نیلے رنگ کی ہوتی تھی، کیونکہ ہرے، لال رنگ سے لکھنے کی اسکولوں میں اجازت نہیں تھی۔ جب فاؤنٹین پین استعمال ہونے لگے تو فاؤنٹین پین بنانے والی کمپنیوں نے اپنی الگ سیاہی کی بوتلیں بیچنی شروع کردیں۔ یہ سیاہی زیادہ عمدہ اور صاف ہوتی تھی جس میں گٹھلی پڑنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا تھا۔ عمدہ قسم کے فاؤنٹین پین میں اگر گھٹیا سیاہی بھر دی جاتی تھی تو وہ لکھنا بند کردیتا تھا۔ چنانچہ عمدہ قلم سے لکھنے والے لوگ اسی کمپنی کی سیاہی خریدتے تھے۔

سیاہی سے لکھنے میں اکثر ایسا ہوجاتا تھا کہ قلم سے کچھ زائد سیاہی گر جاتی تھی، اس کے لیے قلم اور دوات کے ساتھ بلوٹنگ پیپر بھی رکھنا ہوتا تھا جو سیاہی کو اس طرح جذب کرلیتا تھا کہ دھبہ پھیلنے نہیں پاتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی بلوٹنگ پیپر کی ضرورت ہمیشہ رہتی تھی تاکہ صفحہ پلٹنے سے پہلے پچھلے صفحہ کی سیاہی کے گیلے پن کو سکھا لیا جائے اور دوسرے صفحے پر اس کا نشان نہ پڑے۔ امتحان کی کاپی کے ساتھ ایک بلوٹنگ پیپر بھی ملتا تھا۔

روشنائی سے لکھنے میں سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ اس سے ہاتھ اکثر رنگین ہوجاتے تھے اور کپڑوں پر بھی دھبے لگ جاتے تھے جو چھوٹتے نہیں تھے۔

بہت سی ایسی کمپنیاں تھیں جو عمدہ قسم کی سیاہی بناتی تھیں، جن میں سب سے زیادہ مشہور Water Man کی کمپنی کہلاتی تھی۔ مہنگے قسم کے فاؤنٹین پین کے لیے یہی سیاہی خریدی جاتی تھی، جو اس زمانے میں بہت مہنگی تھی۔ 1960 کی دہائی میں Water Man سیاہی کی شیشی پانچ آنے کی آتی تھی جو اتنی بڑی رقم تھی کہ غریب آدمی کا پورا خاندان پانچ آنے میں دونوں وقت کا کھانا کھا لیتا تھا۔

یوں تو اب سیاہی دوات کا رواج ہی ختم ہو چکا ہے اور ان کا استعمال بھی نہیں رہا، لیکن آج بھی پارکر اور شیفرڈ جیسی کمپنیاں ایسے قلم بناتی ہیں جن میں سیاہی بھری جاتی ہے، جس طرح قلم کی قیمت لاکھوں تک پہنچتی ہے، اسی طرح سیاہی کی بوتل بھی ہزاروں کی آتی ہے۔ صرف بہت امیر اور شوقین لوگ ہی یہ قلم اور سیاہی استعمال کرتے ہیں۔

فاؤنٹین پین (انگریزی، اسم، مذکر)

فاؤنٹین پین۔ قلم کی دنیا میں ایک حیرت انگیز ایجاد تھی جس کا

موجد انگلینڈ کا رہنے والا Waterman نام کا شخص تھا، اس کا نام فاؤنٹین پین تھا اور سیاہی کی دنیا میں بڑی شہرت رکھتا تھا۔

فاؤنٹین انگریزی میں فوارے کو کہتے ہیں۔ فوارے میں ایک پائپ کے ذریعے دباؤ کے ساتھ فوارے کے منہ تک پانی پہنچایا جاتا ہے جہاں سے پانی نکل کر چاروں طرف گرتا ہے۔ اس قلم کا نام فاؤنٹین پین اس لیے رکھا گیا کیونکہ اس قسم کے خول کے اندر ربر کا بنا ہوا ایک پائپ لگا ہوتا تھا اور اس کے اوپر اسٹیل کا خول چڑھا ہوا تھا۔ اس پائپ کو نب کے نچلے حصے سے جوڑ دیا جاتا تھا۔ اسٹیل کے کور کو دبا کر سیاہی میں ڈبو دیا جاتا اور چھوڑ دیا جاتا تو پریشر سے سیاہی ٹیوب میں بھر جاتی تھی۔ پھر نچلے والی باڈی کو نب والے حصے سے جوڑ دیا جاتا تھا، لکھتے وقت جب نب پر دباؤ پڑتا تو نلکی سے جڑے ہوئے اس سیاہی بھرے ٹیوب پر دباؤ پڑتا اور نب میں سیاہی آنے لگتی۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ ہر جگہ دوات اور سیاہی لے کر چلنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ شروع میں فاؤنٹین پین کافی مہنگے آتے تھے لیکن بعد میں بہت سی کمپنیوں نے سستے فاؤنٹین پین بنانے شروع کر دیے۔ سستے قلم میں خرابی یہ ہوتی تھی کہ نب پر اگر زیادہ بوجھ یا دباؤ پڑ جاتا تو کاغذ پر بہت ساری سیاہی گر جاتی تھی۔ اس کے باوجود لوگوں میں فاؤنٹین پین کا شوق اور Craze اتنا زیادہ تھا کہ ہر ایک فاؤنٹین پین خریدنا چاہتا تھا۔ شروع میں اسکول کے بچوں کو فاؤنٹین پین سے لکھنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ وہ یا تو پنسل سے لکھتے تھے یا نب والے ہولڈر سے بعد میں اسکولوں میں بھی اونچے درجوں میں فاؤنٹین پین سے لکھا جانے لگا۔ لندن اور امریکہ کی بڑی کمپنیاں جیسے پارکر اور شیفرڈ جن کے نب سونے کے ہوتے تھے بہت مہنگے پین بناتی تھیں جنھیں صرف انگریز اور امیر ہندوستانی ہی استعمال کرتے تھے۔ عام لوگوں کے لیے ہر قیمت کے فاؤنٹین پین ملنے لگے تھے۔ اس میں ایک خرابی یہ ہوتی تھی کہ اگر زیادہ لکھنا ہوتا اور سیاہی ختم ہو جاتی تو لکھائی میں رکاوٹ پڑ جاتی تھی اس لیے اکثر لوگ دو دو، تین تین فاؤنٹین پین رکھا کرتے تھے۔

اب سیاہی اور دوات کی طرح فاؤنٹین پین کا رواج بھی ختم ہو چکا ہے حالانکہ بڑی کمپنیاں فاؤنٹین پین بناتی ہیں جو آٹھ دس لاکھ کے بکتے ہیں لیکن انھیں ایک خاص طبقہ ہی خریدتا ہے جنھیں Antic چیزیں استعمال کر کے اپنی امیری کا رعب جتانا ہوتا ہے۔ اب پارکر اور شیفرڈ مہنگی کمپنیوں نے بھی بال پین اور جیل پین بنانے شروع کر دیے۔ حالانکہ وہ بھی بہت مہنگے ہوتے ہیں۔

قلم دان (فارسی، اسم، مذکر)

قلم اور دوات رکھنے کا چھوٹا سا اسٹینڈ۔ قلم دان یوں تو کئی طرح کے ہوتے تھے۔ مہنگے قلم دانوں میں کئی طرح کی سجاوٹیں بھی لگی ہوتی تھیں لیکن عام گھروں میں دیکھا جائے تو قلم دان لکڑی کا بنا ہوا ہوتا تھا۔ ایک لکڑی کے چھوٹے سے تختے پر ایک چوکور خانہ دوات رکھنے کے لیے اور ایک لمبوترہ خانہ قلم رکھنے کے لیے ہوتا تھا۔ بعض قلم دانوں میں چھوٹا سا ڈیڑھ انچ کا ایک خانہ اور بھی ہوتا تھا جس میں مختلف قسم کے نب رکھے جاتے تھے۔ قلم دان کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ لکھنے کا سارا سامان ایک ہی جگہ محفوظ ہوتا تھا اور وقت پر ہر چیز مل جاتی تھی۔ بڑے سرکاری عہدیداروں یا امیر لوگوں کے یہاں قلم دان مختلف وضع کے اور مختلف شکل کے ہوتے تھے۔ کسی میں کٹاؤ دار لکڑی یا جالی کا استعمال ہوتا تھا تو کسی میں پیتل، تانبے یا ہاتھی دانت کے خانے بنے ہوتے تھے۔ قلم دان لکھائی کے لیے اتنا ہی ضروری ہوتا تھا جتنا آج کل لکھنے والی میز یا ڈیکس ضروری ہوتے ہیں۔ قلم دان میں ایک تہذیب بھی ہوتی تھی اور بچوں کے لیے تربیت بھی کہ بچے اپنی تحریر سے متعلق سبھی چیزیں حفاظت سے رکھیں تاکہ خراب بھی نہ ہونے پائے اور وقت پر آسانی سے مل جائے۔ جیسے آج کل لوگ لکھتے وقت قلم ڈھونڈتے پھرتے ہیں ایسی کوئی پریشانی پیش نہیں آتی تھی۔ مختلف قسم کے قلم ایک ہی جگہ مل جاتے

تھے جیسے تختی پر لکھنے کا قلم، ہولڈر پنسل اور فاؤنٹین وغیرہ۔ سیاہی کی دوات کی بھی حفاظت ہوتی تھی۔ دوات سے سیاہی گرنے یا ٹوٹ جانے کا خطرہ نہیں ہوتا تھا۔ لکھنے کی چوکی الگ ہوا کرتی تھی، جس کی سب سے بڑی زینت یا سجاوٹ قلم دان ہوا کرتا تھا۔ بچے اور بڑوں کے قلم دان الگ الگ ہوتے تھے۔ کوئی بھی دوسرے کے قلم سے نہیں لکھتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لکھتے وقت ہر شخص کا ہاتھ ایک مختلف زاویے سے نب پر زور ڈالتا ہے اور قلم کی نوک بھی اسی زاویے سے ڈھل جاتی تھی۔ اگر کوئی دوسرا استعمال کرلیتا تو قلم کی نوک ٹیڑھی ہوجاتی اور تحریر خراب ہوجاتی۔

گھروں میں استعمال ہونے والی تحریر کے حوالے سے جو چیزیں ہوتی تھیں ان میں تو قلم دان اہم ہوتا ہی تھا اس کے علاوہ قلم دان عہدے کو بھی کہتے تھے جیسے قلم دانِ وزارت، وزیر کا عہدہ یعنی وزیر کے اختیارات، منشی کا قلم دان، محرر کا قلمدان، پٹواری کا قلمدان، جج یا منصف کا قلمدان وغیرہ وغیرہ۔ اس اعتبار سے بھی قلمدان ایک خاص چیز ہوتی تھی کیونکہ اس سے صاحب قلمدان کا عہدہ معلوم ہوتا تھا۔ آج کل اسے Portfollio کہا جاتا ہے۔

نب (انگریزی، اسم، مذکر)

دھات کا بنا ہوا وہ چھوٹا سا آلہ جسے قلم کی زبان کہا جاتا تھا۔ نب ہی کو ہولڈر میں لگا کر، کسی بھی قلم میں لگا کر یا فاؤنٹین پین میں لگا کر لکھنے کا کام کیا جاتا تھا۔ نب زیادہ تر تانبے کا بنا ہوتا تھا، لیکن بہت مہنگے قلم میں سونے کا نب بھی لگایا جاتا تھا۔ نب کی تحریر میں بہت اہمیت تھی، کیونکہ لکھاوٹ کی خوبی اور خوبصورتی نب سے ہی چمکتی تھی، نب خراب ہوتا تو خوشخط آدمی کی تحریر بھی خراب ہوجاتی۔ اس کے علاوہ جس زمانے میں ہولڈر میں نب لگا کر لکھائی کی جاتی تھی اس زمانے میں ہر زبان اور ہر خط کے لیے الگ نب ہوا کرتے تھے۔ جیسے انگریزی لکھنے کے لیے جی کا نب، ہندی لکھنے کے لیے معمولی قسم کا نب اور اردو لکھنے کے لیے تھوڑا سا موٹا نب جس سے اردو کے دائرے اور قوسین خوبصورت بنا کرتی تھیں۔ گھروں میں یہ سارے ہی نب ہوا کرتے تھے۔ خاص طور پر بچوں کے لیے جو لکھائی سیکھ رہے ہوتے تھے، تاکہ ان کا خط خوبصورت بن سکے۔ پرانے زمانے میں خوشخطی کی بڑی اہمیت تھی۔ تختی لکھوانا بھی اسی کا حصہ تھا۔ مدرسوں اور اسکولوں میں بھی بچوں کو ایک صفحہ خوشخط کا ضرور لکھوایا جاتا تھا۔ اس خوبی کو نکھارنے کے لیے الگ الگ نب کی ضرورت ہوتی تھی۔ بازار میں چھوٹے چھوٹے ڈبوں میں نب ملا کرتے تھے اور زیادہ تر ایک یا دو نب خریدنے کے بجائے پورے ڈبے ہی خریدے جاتے تھے، کیونکہ نب بڑی جلدی خراب ہوجاتے تھے۔ زمین پر گر جانے سے، لکھتے وقت نب پر زیادہ زور پڑجانے سے، کسی دوسرے کے ہاتھ پڑجانے سے یا پرانا ہوجانے سے نب خراب ہوجاتا تھا۔ لکھاوٹ خراب ہوجاتی تھی اور نب سیاہی چھوڑنے لگتے تھے اس لیے مستقل طور پر نب بدلنے کی ضرورت پڑتی تھی۔

فاؤنٹین پین میں بھی نب ہوا کرتا تھا۔ اس نب کی نوک پر ایک چھوٹی سی بال کی شکل بنی ہوتی تھی جو سیاہی کو پھیلنے سے روکتی تھی۔ چکنی ہونے کی وجہ سے تحریر صاف اور آسان ہوجاتی تھی، لیکن اس زمانے کے لوگ بچوں کو فاؤنٹین پین استعمال کرنے نہیں دیتے تھے، کیونکہ پرانے نبوں کے مقابلے میں اس سے خط خراب ہوجاتا تھا۔ جیسے آج کل بچوں کو بال پین استعمال کرنے سے منع کیا جاتا ہے۔ نچلے درجوں میں پنسل سے لکھائی ہوتی ہے۔ پرانے زمانے میں نب والے ہولڈر سے لکھائی کی شروعات ہوجاتی تھی۔ ■

ماخذ: لفظوں کے پیچھے چھپی تہذیب تہذیبی فرہنگ، **مصنف:** نعیمہ جعفری پاشا، **پہلی اشاعت:** 2023، **ناشر:** ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔ 110002

چمن چمن کے پھول

شاعری میں بڑی طاقت ہے۔ اس سے تحریر وتقریر میں تاثیر پیدا ہوتی ہے، خطاب میں زور اور تحریر میں قوت پیدا کرنے کے لیے اشعار کا استعمال بہت کارگر ہوتا ہے۔ پرانے زمانے کے لوگوں کو استاد شعرا کے ہزاروں اشعار یاد ہوا کرتے تھے اور وہ موقع کی مناسبت سے ان اشعار کا استعمال بھی کیا کرتے تھے۔
'چمن چمن کے پھول' میں مختلف رنگ اور شاعروں کے شعر اس لیے دیے جاتے ہیں تاکہ بچے موضوع کی مناسبت سے اچھے اشعار یاد کریں اور اپنی تحریر وتقریر میں اشعار کا موزوں اور برمحل استعمال کر سکیں۔ (ادارہ)

دل سے نکلے گی نہ مرکر بھی وطن کی الفت
میری مٹی سے بھی خوشبوئے وفا آئے گی

—لال چند فلک

وطن کے جاں نثار ہیں وطن کے کام آئیں گے
ہم اس زمیں کو ایک روز آسماں بنائیں گے

— جعفر ملیح آبادی

وطن کی پاسبانی جان و ایماں سے بھی افضل ہے
میں اپنے ملک کی خاطر کفن بھی ساتھ رکھتا ہوں

—نامعلوم

دکھ میں سکھ میں ہر حالت میں بھارت دل کا سہارا ہے
بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے نیارا ہے

—افسر میرٹھی

ناقوس سے غرض ہے نہ مطلب اذاں سے ہے
مجھ کو اگر ہے عشق تو ہندوستاں سے ہے

— ظفر علی خاں

ہے محبت اس وطن سے اپنی مٹی سے ہمیں
اس لیے اپنا کریں گے جان وتن قربان ہم

—نامعلوم

اے شہید ملک و ملت میں ترے اوپر نثار
لے تری ہمت کا چرچا غیر کی محفل میں ہے

— بسمل عظیم آبادی

جسے ملک سے اپنے الفت نہیں ہے
وہ دل قابل عفو و رحمت نہیں ہے

—احمق پھپھوندوی

اے خاک ہند تیری عظمت میں کیا گماں ہے
دریائے فیض قدرت تیرے لیے رواں ہے

—برج نرائن چکبست

خوشیوں کے گیت گاؤ کہ پندرہ اگست ہے
سب مل کے مسکراؤ کہ پندرہ اگست ہے

— مفتوں کوٹوی

ہوا سے کہہ دو کہ ساز چھیڑے امر شہیدوں کے بانکپن کا
سناؤ یارو وطن کے نغمے یہ دن ہے آزادیِ وطن کا

—نذیر بنارسی

خوں شہیدان وطن کا رنگ لا کر ہی رہا
آج یہ جنت نشاں ہندوستاں آزاد ہے

—امین سلونوی

رمیشہ ثمین محمد علیم، درجہ ہشتم، نگر پریشد اردو میڈل اسکول نا ندورہ، مہاراشٹر

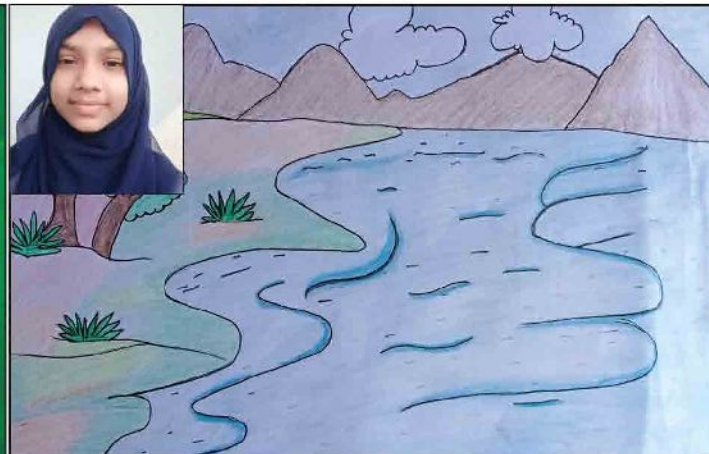

فرحت انجم نظام الدین درجہ ہشتم، گورنمنٹ اردو گرلز ہائر سیکنڈری اسکول
حریر پورہ، برہانپور، مدھیہ پردیش

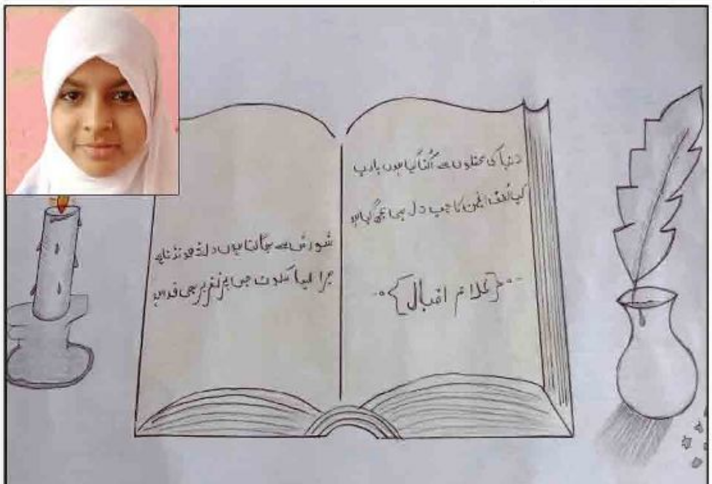

حنا کوثر محمد سلیمان، گورنمنٹ اردو گرلز ہائر سیکنڈری اسکول، حریر پورہ، برہانپور، مدھیہ پردیش

اریبہ رفیق خان، درجہ سوم، المنار پرائمری اینڈ ہائی اسکول
پوار بستی، چکھلی، پونہ، مہاراشٹر

الفیہ شیخ جاوید، درجہ پنجم، اینگلو اردو ہائی اسکول، دونڈائچہ، سندکھیڑا، دھولیہ، مہاراشٹر

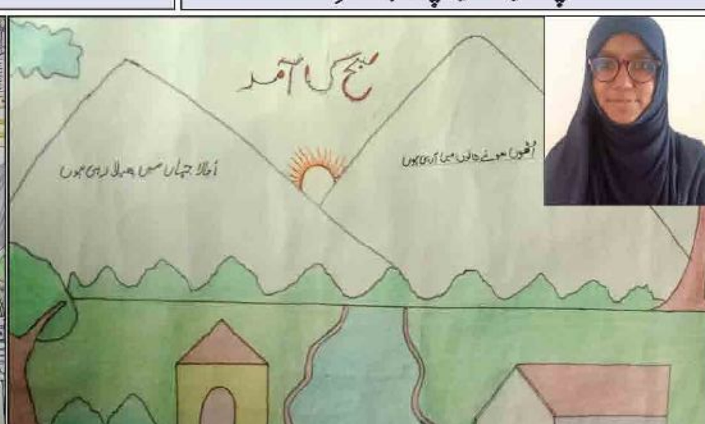

صبیحہ بی شیخ شبیر، گورنمنٹ اردو گرلز ہائر سیکنڈری اسکول، حریر پورہ، برہانپور، مدھیہ پردیش

صالحہ پروین عبیداللہ خان، درجہ سوم، ضلع پریشد اردو اسکول نیم گاؤں، ناندورہ، مہاراشٹر

سارہ مبشر خان، درجہ چہارم، ارم پری پرائمری و پرائمری اسکول
مالیگاؤں، مہاراشٹر

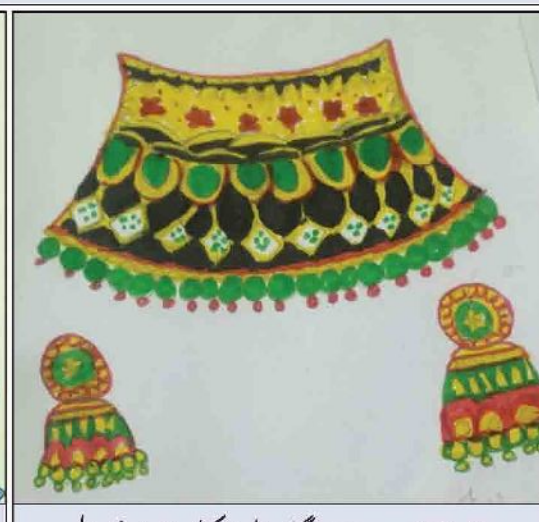

مشکہ رضوی، درجہ X-A، گڈ سمارٹن اسکول، جسولہ، نئی دہلی

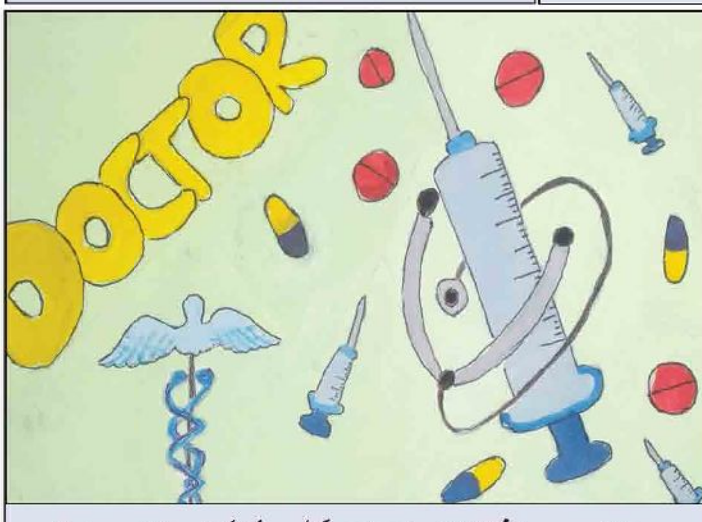

صدیقہ مبین احمد، درجہ ہفتم فریق د، دی مالیگاؤں گرلس ہائی اسکول، مالیگاؤں، مہاراشٹر

یسرا فاطمہ بنت ظفر احمد، درجہ ہفتم، سر سید احمد خان سیمی انگلش اسکول، بیڑ، ضلع دیر، مہاراشٹر

رقبہ تحریم محمد افتخار انصاری، درجہ دوم، گورنمنٹ اردو گرلس ہائر سیکنڈری اسکول
حریر پورہ، برہانپور، مدھیہ پردیش

مسیرہ رحمت محمد رحمت علی، سن رائز ہائی اسکول، مرادنگر، حیدرآباد تلنگانہ

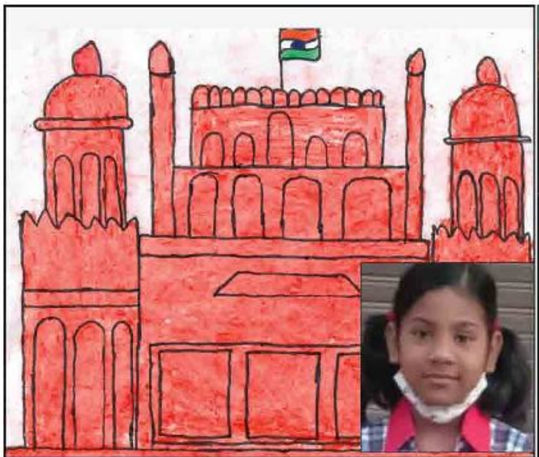

عفیفہ صدیقی، درجہ چہارم (سی) کیندریہ ودیالیہ
ایئرفورس اسٹیشن، ہنڈن، غازی آباد (یوپی)

احسان ابراہیم خان ابن کاشف اللہ خان
گریڈ 2، گلوبل انٹرنیشنل اسکول، دبئی، عرب متحدہ امارات

انصاری عدینہ الطاف، درجہ نہم، ایل ایم سردار اردو ہائی اسکول، دیوپور، دھولے، مہاراشٹر

الصباح اعجاز الدین شیخ، درجہ ششم، بیگم قمر النسا کاریگر گرلز ہائی اسکول و جونیئر کالج، شولاپور، مہاراشٹر

انشا عمر، درجہ ہفتم، ایس وی پبلک اسکول، مانڈیا، چھترپور، پلاموں، جھارکھنڈ

قلمکاروں سے چند باتیں

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' ایک مقبول رسالہ ہے جس میں بچوں کے ذہن اور نفسیات کو نظر میں رکھتے ہوئے معلوماتی مضامین، دلچسپ کہانیاں، پیاری پیاری نظمیں اور دیگر مفید تحریریں شائع کی جاتی ہیں۔ اس رسالے میں کوشش کی جاتی ہے کہ پورے ہندوستان کی نمائندگی ہو مگر بسیار کوشش کے باوجود بہت سے علاقوں کی متناسب نمائندگی نہیں ہو پاتی ہے۔ ایسے علاقوں کے ادیبوں کی جستجو ہماری ترجیحی فہرست میں شامل ہے۔

- رسالے میں بچوں کے ادیبوں کے تعارف اور تصویر کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے تاکہ بچوں کے ادیبوں کی ڈائرکٹری ترتیب دینے والوں کو مدد مل سکے۔
- معلومات عامہ، صحت، زبان شناسی، تاریخ، تہذیب، سائنس و ٹیکنالوجی، جغرافیہ، آثار قدیمہ اور اہم شخصیات سے متعلق تخلیقات ترجیحی طور پر شائع کی جائیں گی۔
- 'مستقبل کے قلمکار' عنوان کے تحت بچوں کی تحریروں کو خاص طور پر شائع کیا جائے گا۔
- بچوں کے ادیبوں کے انٹرویوز اور رسائل کے مدیران پر ایک سیریز شروع کی جائے گی۔

قلمکاروں سے گذارش ہے کہ بچوں کی دنیا کے لیے تحریریں بھیجتے وقت درج ذیل امور کا خاص خیال رکھیں:

- بچوں کے لیے صرف وہی تخلیق ارسال کریں جس سے ان کی معلومات اور آگہی میں اضافہ ہو، خاص طور پر وہ تحریریں جو بچوں میں مطالعے کی تحریک اور ترغیب پیدا کریں۔
- تخلیق کی زبان آسان ہو، مشکل الفاظ سے گریز کریں تو بہتر ہوگا۔
- تخلیق غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلّے میں ارسال نہ کی گئی ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 1200 (بارہ سو) الفاظ سے کم اور 2000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون کے ساتھ اپنا تعارف مع تصویر ارسال فرمائیں۔ تعارف میں بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں اور مضامین کا اندراج ضرور فرمائیں۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- تخلیق کی اشاعت کے درمیان کم سے کم تین (3) ماہ کا فاصلہ لازمی ہے۔ اس سے کم مدت میں تخلیق کی اشاعت کے لیے اصرار نہ فرمائیں۔
- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کو زیادہ مفید مطلب بنانے کے لیے آپ سب کے مشوروں اور تعاون کی ضرورت ہے۔

—ادارہ

बच्चों की दुनिया मासिक,अगस्त 2023, वर्ष 11, अंक 08
BACHON KI DUNIYA Monthly, August 2023 Vol. 11, Issue: 08
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439/2022-24
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/07/2023
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

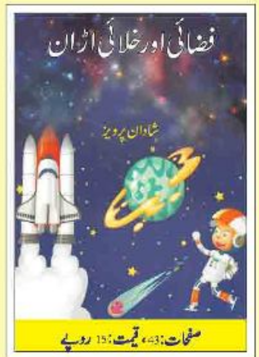

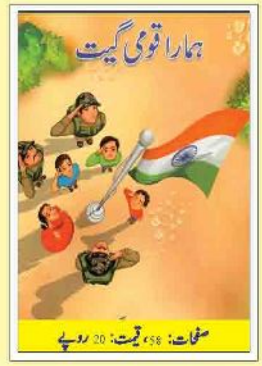

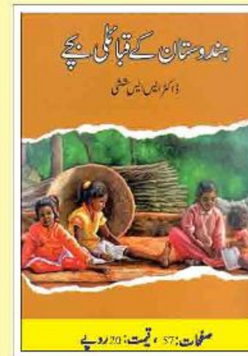

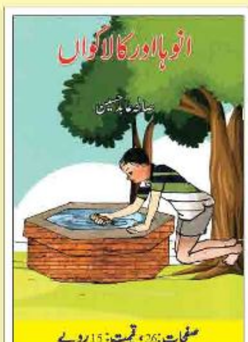
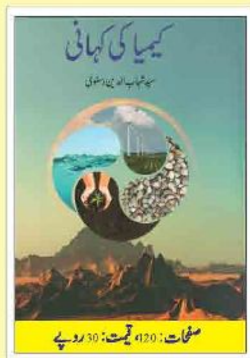

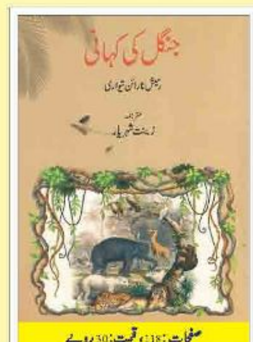

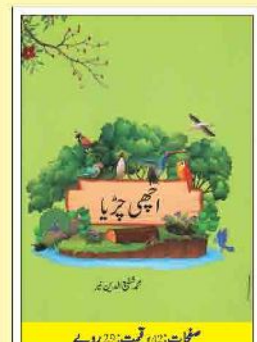

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6